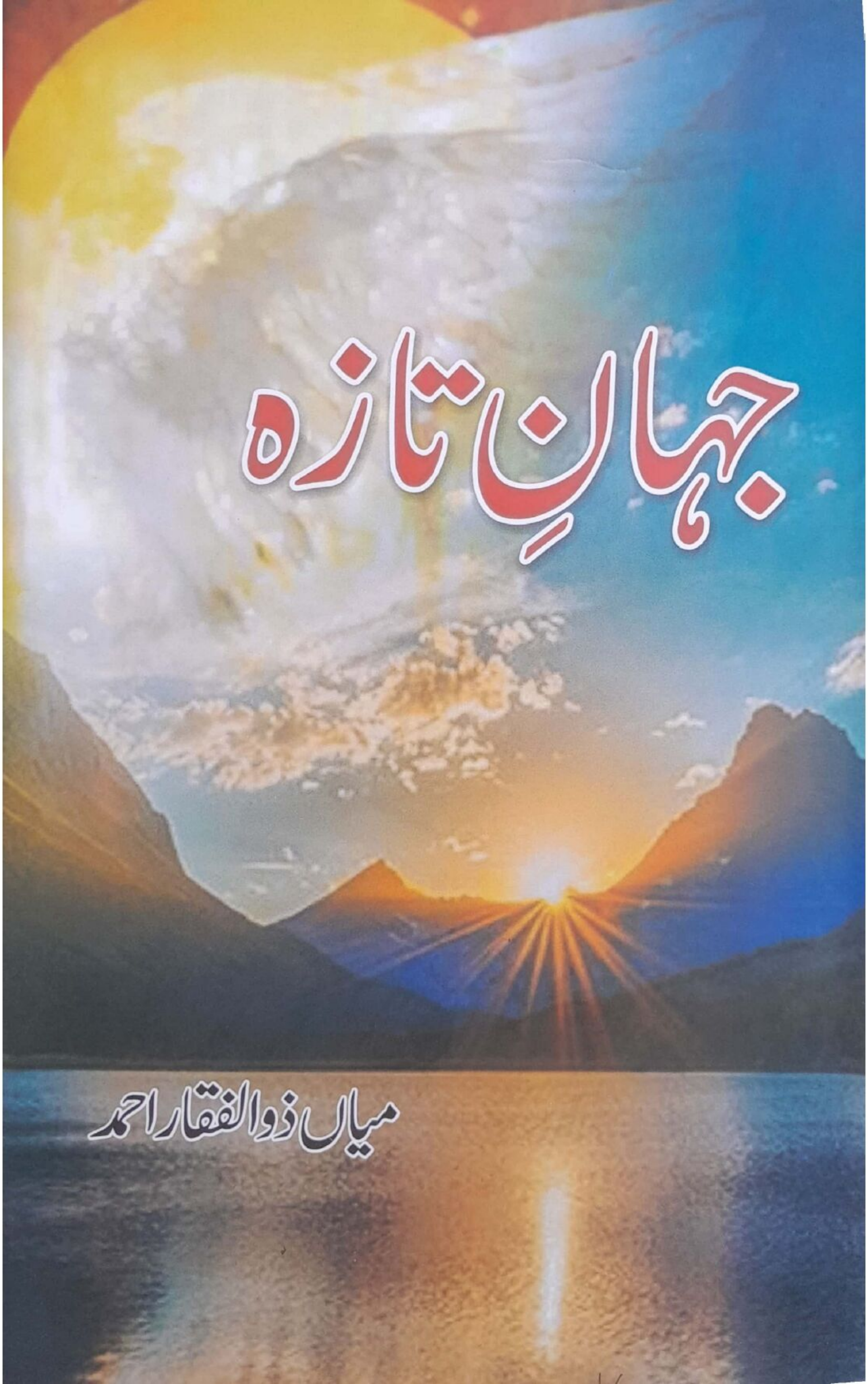
جہانِ تازہ
میاں ذوالفقار احمد

جہانِ تازہ

میاں ذوالفقار احمد

جہانِ تازہ

میاں ذوالفقار احمد

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

جملہ حقوق محفوظ ©

اشاعت : جنوری 2021
کتاب : جہانِ تازہ
مصنّف : میاں ذوالفقار احمد
کمپوزنگ : حرم کمپیوٹرز، میرپور
قیمت : 400 روپے
مطبع : سلیم نواز پرنٹنگ پریس

Jahan-e-Taza

by

Mian Zulfiqar Ahmad

Edition - January 2021

اہتمام
مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
+92-41-2615359, 2643841, Cell:0300-6668284
E-mail: misaalpb@gmail.com
شوروم
صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

انتساب

برادرِ کبیر میاں افتخار احمد

کی شفقت کی نذر

فہرست

ابتدائیہ
9

ایگلز نیسٹ
14

دیوارِ چین
20

دردِ دل کے واسطے
36

ستان ممالک
47

احساسِ زیاں
67

مولانا رومیؒ کے حضور
86

ارطغرل کی سرزمین پر
90

یادِ ماضی عذاب ہے
95

اپنے محسن کی تلاش میں
107

معزز قارئین
اس کتاب کے صفحہ 22 پر لفظ Departure Lounge
پڑھا جائے اور صفحہ 25 پر 30 بلین کی بجائے 30 ملین پڑھا جائے۔

ابتدائیہ

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

میرا تعلّق آزاد کشمیر کے مشہور عارفِ کامل حضرت محمد بخشؒ کے خانوادے سے ہے۔

میں میاں محمد بخشؒ کے برادرِ خورد میاں علی بخشؒ ابن میاں فرمانؒ علی ابن میاں غلام حسین مرحوم کا بیٹا ہوں۔ والدمحترم کی وفات کے وقت دوسری جماعت کا طالبِ علم تھا۔ میرے بھائی بالترتیب میاں گلزار احمد، میاں افتخار احمد، میاں سرفراز احمد اور میاں امتیاز احمد ہیں۔ میری ابتدائی تعلیم چیچیاں پرائمری سکول سے ہے جو اُس وقت ایک بنجر قطعۂ اراضی پر مشتمل تھا۔ کلاس روم زمین پر چونے کی لگائی گئی لائنوں سے بنے ہوئے تھے۔ افضل پور ٹیچر ٹریننگ انسٹیٹیوٹ کے زیرِ تعلیم اَنڈر ٹریننگ اساتذہ اپنا بلیک بورڈ اور ایزل لے کر اکثر ہمارے سکول آتے تھے۔ سموال شریف مڈل سکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ ہائی سکول افضل پور سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی سمیٹی۔

گورنمنٹ انٹر کالج میرپور میں داخلہ لیا۔ F.Sc کی بجائے F.A میں داخلہ

لیا تا کہ پڑھائی پر زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔ فرسٹ ایئر کے بعد ہمارا کالج نیو میر پور کیمپس میں منتقل ہوا۔ سال اوّل کی جماعت میں 172 طلبہ و طالبات تھے جن میں غالباً دس سے زیادہ طالبات منگلا ڈیم پر کام کرنے والے انجینئرز کی بیٹیاں تھیں۔ باقی تقریباً 160 ساتھی طالب علموں میں سے صرف چند کے نام اب یاد ہیں جن میں سرِفہرست چودھری محمد افضل آف منڈا، راجہ عبدالرحمٰن آف گیگن، چودھری علی شان ایڈووکیٹ مرحوم آف کھیلاں، چودھری خادم کھیلاں، چودھری خورشید صاحب (جو بعد میں کمشنر بھی رہے) ہیں۔ راجہ ظفر (کمشنر) اور جاوید نظامی (مرحوم) بھی سیکنڈ ایئر میں ہمارے ساتھ رہے، چودھری عزیز اور چودھری جلیل (جو غالباً چچا بھتیجا تھے) مجھے یاد ہیں۔

ایک دن ہم چند دوست بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے کہ ذکر شیخ محمود احمد (پرنسپل) کی ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ کا ہوا؛ جسے سن کر مجھے اپنے مستقبل تاریک نظر آیا کیونکہ اُس وقت میرے برادر محترم میاں افتخار احمد مجھے بھی ماہانہ ایک ہزار روپے انگلینڈ سے بھیج رہے تھے۔ اُس رقم سے میرے ہاسٹل کے اخراجات، دوستوں کے ساتھ سینما اور سیر و تفریح کے بعد کچھ نہیں بچتا تھا۔ اس لیے ایک دوست (جو انگلینڈ سے تھے) کے کہنے پر فیصلہ ہوا کہ کم از کم میرا مستقبل پاکستان میں نہیں اس لیے انگلینڈ کا رُخ کیا جائے۔ میرے پاس دوست ایجنٹ کو دینے کے لیے رقم نہ تھی۔ میں اپنے برادرِ محترم میاں افتخار احمد کو پڑھائی ترک کرنے کا فیصلہ بتانے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ اُن کے سوا پیسوں کا بندوبست بھی ناممکن تھا۔

آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ اگر میں ایک گروپ (جو غالباً 9 آدمیوں پر مشتمل تھا) کی قیادت کر کے جاؤں تو میرا خرچ میرے دوست ایجنٹ بشیر بسمل برداشت کریں گے۔ دوسرا گروپ ایک پچاس سالہ منگا خان لے کر بذریعہ کوئٹہ، نوکنڈی، تفتان، زاہدان، کرمان سے تہران پہنچے گے اور ہمیں ملیں گے۔ جب دوسرا گروپ تہران پہنچا

تو میرے گروپ کا ایک لڑکا جو عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا تھا۔ مزید سفر نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُسے اپنی اماں کی بہت یاد آ رہی تھی۔ وہ اجنبی ماحول اور کھانوں سے تنگ آ گیا تھا۔

منگا خان نے دونوں گروپ ساتھ لیے اور ترکی روانہ ہو گئے۔ میں اور وہ لڑکا (بدقسمتی سے مجھے اُس کا نام اب یاد نہیں۔) تہران ٹھہر گئے اور بشیر بسمل کا انتظار کرنے لگے۔ چند دن بعد تار موصول ہوا کہ بشیر صاحب براستہ سڑک نہیں آ رہے۔ وہ لڑکا مسلسل پریشان تھا میں نے اُسے واپسی کا خرچ دیا اور زاہدان کی بس میں بٹھا دیا۔ میرے پاس صرف چند دنوں کا ہوٹل کا خرچ بچا تھا۔ اس لیے بھائی صاحب کو بالآخر بتانا پڑا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُنھوں نے ناراض ہونے کی بجائے صرف یہ بتایا کہ میں ایف۔اے سیکنڈ ڈویژن میں فیل ہو گیا ہوں۔ جس کا مطلب تھا پاس تو ہو گیا ہوں مگر پڑھائی کے مقصد میں فیل ہو گیا ہوں۔ بہر حال اُنھوں نے بتایا کہ میرا Lufthansa کا تہران سے فرینکفرٹ کا ٹکٹ امریکن ایکسپریس سے بھیج دیا ہے۔(جو فرضی نام کے پاسپورٹ سے مطابقت رکھتا تھا۔) ساتھ ہی 25 پاؤنڈ بھی خرچ کے لیے بھیج دیے ہیں۔ بہر حال ٹکٹ تو مجھے مل گیا مگر پیسے نہ ملے۔ میں فرینکفرٹ پہنچا جہاں چند دن ٹھہرنے کے بعد بلجیم اپنے گروپ کے پاس جا پہنچا جن میں میرے دوست چودھری عبدالرشید پوٹھی، پہلوان مجید اور لالہ مجید وغیرہ شامل تھے۔ ہمیں بلجیم سے انگلستان پہنچنے میں کئی ماہ کا عرصہ لگا۔

انگلینڈ میں پہنچ کر بھائی جان کی خواہش تھی کہ میں Aeronautical کالج میں داخلہ لوں۔ میں ساڑھے سولہ سال کا لڑکا جو کالج چھوڑ کر بذریعہ سڑک انگلینڈ کے لیے نکلا تھا۔اب ساڑھے سترہ سال کا ایک Seasoned نوجوان تھا جس نے کئی ملکوں کا معمولی رقم اور زبان نہ جاننے کے باوجود کامیابی سے سفر کیا تھا۔ اب کالج وغیرہ کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ سیدھا عملی زندگی میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا چاہتا تھا۔

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

مجھے پہلی نوکری OXFORD Royal Infirmary میں وارڈز کا فرش صاف کرنے کی ملی۔ کئی نوکریاں کرنے کے بعد خیال آیا کہ مزید تعلیم کی ضرورت ہے۔ 1968ء میں ایک پرائیویٹ کالج برمنگھم سے کمپیوٹر پروگرامنگ کے بعد System Analyst کا کورس کیا۔ کلاس میں تقریباً پندرہ سفید فام لڑکے لڑکیاں کمپیوٹر کے متعلّقہ نوکریاں کر رہے تھے۔ میں واحد متعلّم تھا جو فیکٹری میں کوالٹی کنٹرولر کی نوکری کر رہا تھا بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے میں ہی تھا جس کے پاس کمپیوٹر پروگرامنگ کا ڈپلومہ بھی تھا۔ جس کمپنی میں کام کر رہا تھا وہاں بارہا کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ میں آسامیوں پر اپلائی کرنے کے باوجود انٹرویو کے لیے بھی نہ بلایا گیا۔

خیر اللہ کا کرم ہوا اور مجھے اُسی کمپنی میں کوالٹی کنٹرولر میں ترقی ملتی گئی حتیٰ کہ Dynamo کے بجائے Alterator متعارف کرایا گیا تو نئی پراڈکٹ پر مجھے کوالٹی کنٹرولر فورمین کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ 1973ء کے شروع میں مجھے بتایا گیا کہ سال ختم ہونے سے پہلے کوالٹی انجینئر اور ڈیپارٹمنل ہیڈ کے لیے کورس کرایا جائے گا۔ جولائی میں والدہ محترمہ کی طبیعت کی خرابی کا خط ملنے پر میں پاکستان آ گیا۔ فروری 1974ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گیا۔ شادی کے ایک ماہ بعد واپس انگلینڈ جانا پڑا۔ اس کے بعد 1978ء میں بذریعہ سڑک واپس پاکستان آیا جو پندرہ دن کا سفر تھا۔ 2/اگست 1979ء کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی سے نوازا جس کا نام انیسہ ذوالفقار ہے اور میں ہر آدمی کو ایسی نیک فرماں بردار بیٹی کی دُعا دیتا ہوں:

مبارک باد بیٹی کے جنم پر دے رہے ہیں لوگ
مگر مجھ سے مٹھائی کا تقاضا کیوں نہیں کرتے

انیسہ اپنی ماں کے ساتھ ساڑھے چار سال کی عمر میں میرے پاس انگلینڈ پہنچ

گئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نفیسہ ذوالفقار سے نوازا، میرا بیٹا اویس عبدالجبار 1985ء میں پیدا ہوا۔ مصباح ذوالفقار اور رئیسہ ذوالفقار کی پیدائش کے بعد میرا خاندان مکمّل ہوا۔ مجھے اپنے ہر بچے پر اللہ پاک کا بے انتہا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ پاک ان سب کو مع اہل وعیال اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین! میں نے 1980ء سے اپنا کاروبار شروع کیا جس میں چند ماہ ٹیکسی چلائی۔ اپنے بچپن کے دوست رشید احمد کی شراکت سے سپر مارکیٹ کا کاروبار کیا۔ اس کے بعد Real Estate اور Financial Services میں اپنے بیٹے کا ہاتھ بٹایا ہے۔ انگلینڈ کے علاوہ جرمنی میں بھی سرمایہ کاری کی مگر کچھ عرصہ بڑے نقصان کے بعد کاروبار کو بند کرنا پڑا۔

میں چار بار ریٹائر ہو چکا ہوں مگر گھر آرام سے بیٹھنا مشکل ہے۔ بے شک میں تقریباً 40 سال سے کاروبار میں مصروف رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں اپنے بچوں اور نواسوں کو تقریباً تمام مڈل ایسٹ، یورپ اور امریکہ گھما لایا ہوں۔ 2019ء میں سب سے لمبا سفر اپنی بیٹی، سفر کی بہترین ساتھی نفیسہ ذوالفقار کے ساتھ کیا۔ ہم تقریباً ہر روز دن کے اختتام پر مختصر ڈائری نوٹ لکھ لیتے تھے۔ COVID-19 کے آنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ شاید سفر نامے کے قاری کے لیے باعث دل چسپی ہوں گے۔

محترم پروفیسر عابد محمود عابد سے مشورہ کیا کہ کیا یہ کتابی صورت میں چھپنے کے قابل ہیں۔ ان کی ہدایت پر ان نوٹس کو ایک سفرنامہ کی صورت میں پیش کرنے جا رہا ہوں۔ میں ان کا برمحل اشعار کی فراہمی اور مسودے کی حروف خوانی کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ یقین جانیے بے شک سفر نفیسہ اور میں نے کیا ہے مگر اس سفر نامے کو دل چسپ بنانے کا مشکل کام پروفیسر صاحب نے کیا ہے۔ میری دُعائیں ہمیشہ پروفیسر صاحب کے ساتھ ہیں۔ حرم کمپیوٹرز کے عمران منظور کا بہ صمیمِ قلب شکر گزار ہوں جنھوں نے کمال خوب صورتی سے میری کتاب کو کمپوز کیا۔ اللہ اُنھیں سلامت رکھے۔

میاں ذوالفقار احمد

ایگلز نیسٹ

آج 16 اکتوبر 2019ء شام کو تمام سامان پیک کیا۔ سب کو خدا حافظ کہہ کر تھوڑا سونے کے لیے بستر پر گئے۔ یونس صاحب (جو ہمیں پاکستان کے قیام کے دوران میں ٹرانسپورٹ مہیا کرتے ہیں۔) حسبِ وعدہ 3:30 صبح سے کچھ دیر پہلے گاڑی لے کر گیٹ سے داخل ہوئے اور سامان گاڑی میں رکھنا شروع کیا۔ میں نے نہا کر دو نوافل ادا کیے۔ میں اور بیٹی نفیسہ ذوالفقار گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حمیرا (گھر کے نگران اشرف بابا کی بہو) نے ہمیں خدا حافظ کیا اور ہم اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم تقریباً 6 بجے سے پہلے فیض آباد اڈے پر پہنچے اور گل فراز (ڈرائیور) کو فون کیا تو اُس نے معذرت کرتے ہوئے دس منٹ اور مانگے۔ وہ دس منٹ کے بعد سفید ہونڈا BR-V لے کر پہنچ گیا۔ سامان لادنے کے بعد ہم نے یونس کو الوداع کیا اور گُل فراز کے ساتھ نئے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ اگر بابوسر ٹاپ پر برف نہیں پڑی تو ہم اِن شاء اللہ آج رات چلاس پہنچ جائیں گے۔

ایک جگہ ہمارے ڈرائیور نے اشارے سے بتایا کہ بالاکوٹ پر انڈین ایئر فورس نے بم گرا کے کیمپس تباہ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً 6 گھنٹے اور اس ڈرائیور کو 4 گھنٹے گزرے تھے۔ ہم ایک ہوٹل پر ناشتے کے لیے رُکے؛ چنے پراٹھے

اور چائے سے ناشتہ کیا۔ ہوٹل دریا کنارے واقع ایک خوب صورت جگہ پر موجود تھا اس لیے ہمیں بہت سکون محسوس ہوا۔ ہمارا سفر نہایت تیزی سے جاری رہا اور وقتاً فوقتاً ڈرائیور موسم کا حال جانتا رہا کیونکہ بابوسر ٹاپ پر برف باری یا زیادہ بارش کی وجہ سے راستہ بند ہو گیا تو ہمیں واپس مانسہرہ آکر لمبے راستے سے دوبارہ سفر شروع کرنا پڑتا۔ بالآخر ہماری گاڑی نے چڑھائی چڑھنا شروع کی اور کچھ دیر بعد ہمارے کانوں نے POP کرنا شروع کر دیا جس کا معنی یہ تھا کہ ہم سطحِ سمندر سے خاصی اُونچی جگہ پہنچ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک خوب صورت جھیل پر رُکے اور جب باہر نکلے تو محسوس ہوا کہ پنجاب کا گرم موسم بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ یہاں انتہا کی سردی تھی اور تھوڑی تھوڑی برف باری بھی شروع ہو چکی تھی۔ اس جھیل پر بھی سیاح کھڑے تھے جن میں سے زیادہ اہلِ لاہور تھے۔

ہم نے چند منٹوں کے بعد ہی اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا چونکہ موسم بگڑتا جا رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے ہم اُس مقام سے گزر گئے جہاں پر موسم کی خرابی کی وجہ سے گاڑیوں کو روک دیا جاتا ہے۔ آگے جا کر ڈرائیور نے ہمیں وہ جگہ دکھائی ہے جہاں پر کچھ عرصہ پہلے ایک بدقسمت بس کو ایکسیڈنٹ کا سامنا کرنا پڑا اور خاصی اموات ہوئیں۔ بالآخر ہم بابوسر ٹاپ کی چوٹی پر پہنچ کر رُکے۔ یہاں پر آکسیجن کی کمی کے باعث سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی اور ساتھ یخ ہوائیں جسم کو مزید ٹھنڈا کرتی تھیں۔ ہم نے یہاں چائے لی اور نفیسہ کے نفیس بیکری سے خریدے گئے بسکٹوں نے معدے اور جسم کو تقویت پہنچائی۔

اب ہمیں چلاس پہنچ جانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اور ہم رات دیر سے شنگریلہ ہوٹل پہنچے تو ہوٹل کچھ سیاحوں اور خاص کر چینیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارا سامان کمرے میں پہنچا تو ہم تقریباً پندرہ، سولہ گھنٹے کے سفر کے بعد تھکان سے چور ہو چکے تھے۔ تھوڑا کھانا کھایا اور نماز ادا کرنے کے بعد سو گئے۔ صبح ناشتے کے بعد ہم گلگت کی

طرف روانہ ہو گے۔

آج ہم شاہراہ ریشم پر سفر کر رہے تھے۔ راستے میں سڑک دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ جگہ جگہ لینڈ سلائیڈنگ کا خطرہ موجود تھا جو خنجراب بارڈر پوسٹ تک موجود رہا۔ ہم نانگا پربت کے ویو پوائنٹ پر رُکے۔ اس کے بعد راکا پوشی کے ویو پوائنٹ پر رُکے۔ دور سے K-2 چوٹی کو دیکھا مگر دھند کی وجہ سے صاف چوٹیاں نہیں دکھائی دیں۔ اس کے بعد ہم نے وہ مقام دیکھا جہاں پر ہمارے دائیں جانب سلسلہ کوہ ہمالیہ سامنے سلسلہ قراقرم اور بائیں جانب ہندوکش یعنی دنیا کے تین بڑے پہاڑی سلسلے ملتے ہیں۔ تینوں کے علیحدہ علیحدہ رنگ ہیں۔ وقت کی قلت اور کسی خاص مقام کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے گلگت شہر کے اندر جانے کی بجائے باہر ہی سے ہنزہ کی طرف سفر شروع کر دیا۔ بے شک ایبٹ آباد بلکہ ہری پور سے قدرتی مناظر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مگر یہاں قدرتی حسن کا ایک الگ معیار تھا۔

ضلع شوگران اور اس کے بعد ضلع ہنزہ میں داخل ہوئے۔ پہاڑوں کی خوب صورتی، وادیوں کی دل کشی اور لوگوں کے اخلاق کی کیا ہی بات تھی۔ یہاں کی تقریباً واضح اکثریت اہلِ تشیع عقیدہ رکھتے ہیں اور باقی طبقہ آغا خانی اسمٰعیلی مسلک کے حامی ہیں۔ ہم شام کو ہنزہ کے مرکزی شہر کریم آباد پہنچ کر ہوٹل دربار میں دو رات قیام کے لیے ٹھہر گئے۔ یہ ہوٹل ایک اونچے مقام پر واقع ہے۔ چاروں طرف پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے بھری پڑی تھیں اور سخت سردی تھی۔ رات کو AC Inverter لگانے کے باوجود سردی سے ٹھٹھر رہے تھے اور دوسرے دن ایک اور کمرے میں شفٹ ہو کر گزارہ کیا۔

اگلے روز ہنزہ میں ہم نے ایلیٹ فورٹ، ہوپر گلیشیر اور Eagles Nest کا نظارہ کیا۔ آج صبح سویرے جاگنے کے بعد ہم نے سیدھے ہوپر گلیشیر پر چڑھ کر K-2 کا نظارہ کیا۔ میں نے اہلیہ سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ نفیسہ کو کوئی خطرناک ایڈونچر نہیں

کرنے دوں گا۔مگر اس نے تو وعدہ نہیں کیا تھا۔ انسان اتنی خوب صورت جگہ پر آئے اور انجوائے نہ کرے یہ ناممکن ہے۔ نظارے نہایت ہی خوب صورت تھے۔ خطرناک چڑھائیاں بھی تھیں مگر وہ بہت زیادہ اوپر نہ گئی جتنی اسے خواہش تھی۔ بہر حال نفیسہ نے اپنی زندگی کا پہلا قیمتی پتھر برتھ سٹون (GEM Stone) دکان سے خریدا۔ دکان دار نے مہمان نوازی کے طور پر پھولوں والی چائے بھی دی جسے میں انوکھی چائے بولتا ہوں۔

اس سے اگلا سٹاپ بالیتت کا شکست و ریخت ہوتا ہوا قلعہ تھا۔ یہ قلعہ ایک شہزادی کو جہیز میں اس لیے ملا تھا کیوں کہ اُس کے خاوند کے پاس شہزادی کے معیار کی رہائش گاہ نہ تھی تو شہزادی کے والد نے اپنی بیٹی کے لیے یہ قلعہ بنوایا۔ ہمارے گائیڈ نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ یہاں ایک نافرمان چھوٹے بھائی کو بڑے شہزادے نے ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔نفیسہ نے پہاڑ کی چوٹی Eagle's Nest (عقاب کا گھونسلہ) سے نہایت دل فریب منظر دیکھا۔ میں اسے نیچے رہنے کے لیے کہہ رہا تھا تاکہ وہ کہیں پھسل نہ جائے۔اس نے کہا آپ فکر نہ کریں۔نفیسہ کے مطابق K-2 اور جیٹ سکی کے بعد Eagle's Nest کی اُونچائی اور نفیسہ کی مہم جوئی کی خواہش میرے اعصاب پر بھاری ہو رہی تھی اس لیے وہ مجھے مزید پریشان کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ فرماں بردار بیٹی کی طرح نیچے اُتر آئی۔ اب ہمارا سفر سَست کی طرف شروع ہونا تھا۔مگر ڈرائیور نے پتہ کیا کہ چہلم کے جلوس کی وجہ سے مرکزی پُل 8:30 کو بند ہو جائے گا اور شاید بعد دوپہر کو دوبارہ کھلے گا۔ اس لیے ہم نے 8 بجے اپنا سفر شروع کیا۔

اگلے دن راستے میں 2010 کی لینڈ سلائیڈنگ سے وجود میں آنے والی جھیل عطا آباد پر رُکے۔ نفیسہ نے جھیل میں Jetski بھی کی۔ پاک چین دوستی سرنگوں سے گزرتے ہوئے ہم حسینی پل پر پہنچے۔ یہ پاکستان کا سب سے خطرناک پُل ہے۔ ہم

نے اس پُل پر تقریباً بیس تیس گز تک سفر کیا۔ اس کے بعد ہم Passu Glacier پر پہنچے اور وہاں پر موجود ریسٹورنٹ پر چائے پی۔ گلیشیر سے پگھل کر آنے والے پانی سے شور مچاتی ندی کا نظارہ کیا۔ یہاں کے مشہور خوبانی کیک کو چکھنے کے بعد ہمارا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ نہایت مزیدار، نرم اور خستہ کیک ہے۔ ہم نے ایک پورا کیک خرید لیا جسے کاشغر تک کھاتے رہے۔ ہم دوپہر کے قریب سوات کے ہوٹل جو کہ PTDC کے نام سے گورنمنٹ کا ادارہ چلاتا ہے وہاں پہنچے۔ نفیسہ کو کمرے میں چھوڑ کر میں نے گُل فراز کا شکریہ ادا کیا اور اُسے بخوشی رُخصت کیا تا کہ وہ رات تک چلاس پہنچ جائے۔ میں نے سَست کا معائنہ شروع کیا اور ATM پر کوشش کے باوجود کیش نہ نکلوا سکا تو واپس ہوٹل پہنچا۔ میری طبیعت سخت خراب ہو رہی تھی۔ مجھے سانس لینے میں آکسیجن کی کمی کے باعث مشکل پیش آ رہی تھی۔ Heavenly Place میں ہنزہ کی آخری رات میں نان، دال مع خوبانی جوس لیا تھا۔ یہ بد پرہیزی اب فوڈ پوائزنگ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ دوپہر سے رات کے پہلے پہر تک اُلٹیاں کرتے ہوئے خدا خدا کر کے طبیعت سنبھل گئی۔

اگلے روز ہم نے سَست سے Tashkhuran تک کے لیے بس کا ٹکٹ ہنزہ سے بُک کرایا تھا۔ یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ کچھ لوگوں کے پاس سپیشل پرمٹ ہے اور وہ کار بُک کر کے چین کے شہر تک لے جا سکتے ہیں۔ PTDC والوں نے ہمارا تعارف پڑھے لکھے نوجوان سے کرایا جس نے 25,000 روپے میں ہمیں اپنی Corolla 2012 میں Tashkhuran تک لے جانے کے لیے صبح 8:30 کا وعدہ کیا تھا۔ وہ عین وقت ہمارے Motel پہنچ کر ہمارا سامان گاڑی میں رکھوانے کے ساتھ ہی ہمارے پاسپورٹ لے کے امیگریشن والوں کے پاس جا کر Manifest بنوا لایا۔ کسٹم اور Health Check وغیرہ کرنے کے بعد تقریباً صبح 10 بجے ہم خنجراب پاس کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہمارے پڑھے لکھے ڈرائیور نے بتایا کہ وہ سندھ میں ایک

جرمن کمپنی کا کنسٹرکشن منیجر رہ چکا ہے مگر آج کل نوکری نہ ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر یہ کام کررہا ہے۔ بالآخر ہم خنجراب پہنچے اور دنیا کے بلندترین مقام پرATM استعمال کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یہاں پر سخت سردی، برف باری اور ٹھنڈی ہوا کے ساتھ سانس لینا بھی مشکل تھا۔سرحد عبور کر کے چین کی طرف پہنچے تو معمولی پاسپورٹ پڑتال کے بعد روانہ ہو گئے۔

دیوارِ چین

تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑے کمپاؤنڈ میں بڑے ٹرکوں کے ساتھ تمام گاڑیاں کھڑی ہوئیں۔ مکمّل طور پر کسٹم اور امیگریشن چیک ہوا۔ چین کے آفیسر کا لب و لہجہ کرخت محسوس ہونے کے باوجود حقیقت پسندانہ تھا۔ چند اور چیکنگ پوائنٹ کے بعد ہم خنجراب ڈرائی پورٹ تاشقرن پہنچ گئے اور ڈرائیور کو خدا حافظ کہا۔ یہاں مزید سخت چیکنگ تھی۔ چینی آفیسران ہمیں تجسّس سے دیکھتے تھے کہ ہم برطانوی شہری ہیں اور پاکستانی بھی ہیں۔ بہر حال پاکستانی شناختی کارڈ نے ہماری مدد ضرور کی ورنہ چیکنگ اور بھی سخت ہوتی۔ جب باہر ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے تو ہمارے پاکستانی ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی روکی اور ہمیں نہ صرف لفٹ دی بلکہ آگے کے سفر کے لیے ایک سپیشل چھوٹی ویگن کا مناسب قیمت پر بندوبست کیا۔ مجھے صرف RNB 650 ہی ڈرائیور کو دینے کی ہدایت کی۔ راستے میں بار بار وہ ہمارے ڈرائیور سے بات کرتا رہا اور اُسے ہمارے ہوٹل پہنچنے تک ہدایات دیتا رہا کیوں کہ وہ اُن کی زبان بول سکتا تھا۔ آخری بار جب ہم سلطان ہوٹل کی لابی میں Check in ہو گئے تو اُس نے خدا حافظ کہا۔ میں اُس ذمہ دار پاکستانی مسلمان اور انسان کا ہمیشہ شکرگزار رہوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ جلدی میں اپنے اُس محسن کا نام تک پوچھنا بھول گیا۔

اگلی صبح ہم ناشتے کے ہال میں پہنچے تو سوائے اُبلے انڈے کے سب اشیاء ہمارے لیے نئی تھیں۔ بہر کیف ہم نے صرف چند سبزیاں اور انڈے پلیٹ میں ڈال کر چینی سٹکس سے کھانے کی کوشش شروع کر دی۔ ناشتے سے فراغت کے بعد ہم باہر نکلے اور ٹورسٹ انفارمیشن سے معلومات لینے کے بعد مشہور مسجد عید گاہ کے پاس سے گزرتے ہوئے کاشغر کے پرانے شہر کی طرف چلنا شروع کیا۔ بازار میں انواع و اقسام کے تازہ اور خشک فروٹ تھے اور بے شمار قسم کے کھانے کے سٹال۔ ہم تقریباً ایک گھنٹہ چلتے ہوئے ایک مقام پر پہنچے جہاں پر سیاحوں کا ہجوم تھا اور نہایت خوب صورت ملبوسات میں ملبوس نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ڈانس کر رہے تھے۔ یہ مسلمانوں کا مقامی رقص تھا جو نہایت نفاست اور خوبصورتی سے جاری تھا۔ ایک Love Story بیان کی جاری رہی تھی مگر بے حیائی سے مکمّل پاک۔ ہم کاشغر کے مشہورِ زمانہ Grand Bazar میں گئے جو ایک بہت بڑا بازار ہے۔ شام کو واپس پہنچ کر ایک حلال ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے نہایت مزے دار پلاؤ اور سبزیوں پر مشتمل کالی مرچوں والی ڈشیں کھانے کے بعد ہوٹل آ کر سو گئے۔

اگلے روز صبح سویرے ناشتہ کیا اور مسجد عید گاہ کے اندر گئے۔ بد قسمتی سے مسجد میں نماز کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بعد کاشغر کی سیر کی اور ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہماری فلائٹ تقریباً شام 5 بجے بیجنگ ٹائم عروچی لینڈ کر گئی۔ جوں ہی سامان لے کر نکلے تو چند نوجوانوں نے ٹیکسی، ٹیکسی پکارا تو ہم خوش ہوئے مگر پتہ چلا کہ انگلش کا لفظ ٹیکسی ہی انہیں معلوم ہے۔ ڈرائیور نے 300 (چائینیز کرنسی) کرایہ مانگا تو میں نے 150 آفر کیا آخر سودا 200 تک ہو گیا اور ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ کچھ فارسی، کچھ انگلش اور کچھ اشاروں کی زبانیں ملا کر حلال کھانے کی جگہ ہم نے ہوٹل کے قریب پتہ لگا لی اور Ji Hotel پہنچ گئے مگر انگلش سپیکنگ ندارد۔

ع   زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

رات کو حلال پلاؤ جسے پولو کہتے ہیں وہ اور گوشت کی یخنی کی ڈش مع گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کھا کر سو گئے۔ شائستہ کا پریشان کُن فون سن کر طبیعت بوجھل ہو گئی اور انگلینڈ والوں سے رابطے میں باقی دن گزارا۔ صبح سویرے ٹیکسی لے کر بُلٹ ٹرین کے ٹکٹ خریدنے کے لیے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ ہوٹل نے گوگل ٹرانسلیٹر کی مدد سے ایک کارڈ پر Turfan کے لیے ٹکٹوں پر وقت Chinese میں لکھ دیا تھا جو ہم نے ریلوے بکنگ کلرک کو دیا اور ٹکٹ خرید لیے۔ ہم نے گرینڈ بازار، گرینڈ مسجد اور مسلمانوں کے اکثریتی علاقے کے لیے ہوٹل سے ٹیکسی پکڑی۔ کافی دیر کے بعد پتہ چلا کہ مساجد میں نماز جمعہ کل صرف ایک مسجد بیت المعمور میں ادا ہو گی۔ ایک شخص نے 12 بجے اور دوسرے نے 1:30 کا ٹائم دیا مگر مسجد ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔ گوگل کی مدد سے بھی کامیابی نہ ہوئی۔

آج ہم نے آرام کیا اور Site Seeing شہر کے اندر ہی گزارا۔ اگلے دن ہم ریلوے سٹیشن پہنچے جو ایک ایئرپورٹ طرز کی نئی بلڈنگ ہے۔ سامان کی چیکنگ بھی ایئرپورٹ کی طرح کرانے کے بعد اب ہم Departure Launch کے وسیع ہال میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہماری ٹرین کی روانگی کو ابھی سوا گھنٹہ باقی ہے۔ ہم انتظار میں بیٹھے اعلانات سن رہے ہیں جو چینی اور دیگر زبانوں میں ہونے کی وجہ سے ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ یہاں پر یہ احساس اور زور پکڑ رہا ہے کہ یہ قوم بجا طور پر امریکہ کے بعد دوسری طاقت ور معیشت کی مالک ہے۔ شاید وہ دن دور نہیں جب یہ دنیا کی سب سے بڑی اور طاقت ور قوم بن جائے گی۔ ایک مغربی کاروباری فرد ہونے کی حیثیت سے میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ ایک طرف Collectively Organise اور دوسری طرف انفرادی جذبہ سے بھرپور اوپن اکانومی کا Fusion ایک نہایت ہی Efficient سسٹم ہے جو بہت اچھی طرح نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں آج سے پہلے نہیں ملتی۔

مجھے یوں دکھائی دے رہا ہے کہ آئندہ بیس، تیس سالوں میں چین دنیا کو ایک ایسا ماڈل مہیا کرے گا؛ جو تمام ترقی پذیر ملکوں کے لیے مشعلِ راہ ہوگا اور ترقی یافتہ ممالک بھی اس سسٹم سے کچھ حصے ضرور اپنائیں گے تاکہ اُن کی ترقی کی سست روی پر قابو پایا جا سکے۔ طُرفان کے پہاڑوں کو سرخ رنگت اور بناوٹ کی وجہ سے فلیمنگ ماؤنٹین کہتے ہیں وہاں کے انگور منقا اور ساوَ گی بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ہم نے یہ پھل خریدے۔ یہاں پر دو ہزار سال پرانی زمین دوز نہروں کا وسیع و عریض سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ یہ سلسلہ اس علاقے میں پانی کی ضرورت کو پورا کرتا رہا ہے۔ مقامی آبادی وقفے وقفے سے بور کر کے اور ڈول ڈال کر اپنی اور مال مویشیوں کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

آج ہم طُرفان سے Xian بذریعہ ریل جا رہے ہیں۔ یہ سفر 24 گھنٹے سے زیادہ پر مشتمل ہوگا۔ ہم شام کی ٹرین جو Sleeper ٹرین ہے سے Xian کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ ہمارا سفر زیادہ دیر بستر پر سوتے ہوئے گزرا۔ راستے میں ہم Gansu کے صوبے سے گزرے جو بہت پسماندہ علاقہ ہے۔ ہم دوسری شام کو Xian پہنچ گئے۔ نفیسہ بیٹی کی طبیعت کافی خراب ہو رہی تھی زکام کی وجہ سے سر درد شدید سے شدید تر ہو رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے ہم ہوٹل میں پہنچ کر سو گئے۔ دوسرا دن ہم نے اولڈ سٹی میوزیم کو دیکھتے گزارا۔ یہ شہر چین کا دارالخلافہ رہ چکا ہے۔ اولڈ سٹی سے اس شہر کو محفوظ کیا گیا تھا۔ قلعہ نما دیوار کم از کم 50 سے 60 فٹ موٹی نہایت سخت اینٹوں پر مشتمل سارے شہر کے اِرد گرد تھی۔ تقریباً 3 سے 4 میل چوڑائی اور 5 سے 6 میل لمبائی مستطیل نما شہر سترہویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس شہر کے تقریباً وسط میں 1300 سال پہلے Xian Grand Mosque تعمیر کی گئی جسے میں نے آج شام کو دیکھا۔ اِن شاء اللہ کل یہاں نمازِ مغرب ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔ بازار سے گزرتے ہوئے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ وہ مسجد کے امام ہیں۔ اُنہوں نے مجھے مسجد کے متعلّق ایک

کتاب دستخط کر کے تحفہ دی۔

آج ہم Terracota Warrier Tour کو دیکھنے گئے۔ فیکٹری بھی دیکھی اور میوزیم بھی۔ ایک بادشاہ Qin نے آج سے تقریباً 2300 سال پہلے یہاں حکومت کی اور اُسے یقین تھا کہ مر جانے کے بعد بھی اُسے بادشاہت ملے گی۔ اُس نے Terracota Warrier آرمی تیار کر کے زمین کے نیچے دفن کر دی۔ اس میں سپاہی، آفیسرز، تیر انداز وغیرہ مکمّل آرمی بنا کر اُن پر چھتیں ڈال کر تقریباً دس پندرہ فٹ گہری مٹی ڈال دی تھی۔ زمین پر کاشت ہوتی رہی حتیٰ کہ 1974 میں زمیندار نے کنواں کھودنا شروع کیا۔ جب کنویں کی کھدائی کے دوران سپاہیوں کے مجسّمے نکلنے شروع ہوئے تو یہ راز افشاں ہوا۔ ابھی تک تین جگہوں پر کھدائی کی گئی ہے۔ بادشاہ کا مقبرہ ایک پہاڑ نما جگہ کے نیچے ہے۔ اس میں ابھی کھدائی نہیں کی گئی کیونکہ بادشاہ نے مقبرہ کے آگے پیچھے پارا ڈلوا رکھا ہے۔ اس لیے یہ خطرناک کام ابھی شروع نہیں کیا گیا۔ آج شام الحمدللہ نماز چین کی سب سے بڑی مسجد میں ادا کرنے کا شرف حاصل کیا بعد میں مسلم گلی میں کھانا کھانے کے بعد ہوٹل گئے۔ صبح اُٹھ کر Chongging کی تیاری کرنی ہے اور Bullet Train سے تقریباً سوا پانچ گھنٹے کا سفر ہوگا۔

31 اکتوبر کو ہم صبح اُٹھ کر ناشتہ کے بعد اگلے سفر کے لیے تیار ہوئے اور ایک آخری چکر Xian کی مین سٹریٹ کا لگا کر بُلٹ ٹرین پر سوار ہوئے۔ٹرین میں سفر شروع کرنے کے بعد دو چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی تو یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ Xian میں میل ہا میل تک بڑے بڑے رہائشی ٹاور تعمیر کیے جا رہے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ بے شک ہماری ٹرین 250 کلو میٹر کی رفتار سے بے شمار سرنگوں سے گزرتی جا رہی تھی مگر محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ٹرین اتنی تیز رفتاری سے چل رہی ہے۔ شام ہوتے ہی ہم Chongging ہوٹل جو ٹائمز سکوائر کے مشہور علاقے میں واقع تھا پہنچ گئے۔ ٹائمز سکوائر کا علاقہ نیویارک کے ٹائمز سکوائر کی طرح روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

یکم نومبر کو نفیسہ کی طبیعت چونکہ تھوڑی بہتر ہوئی تھی۔ تقریباً 3 سے چار گھنٹے سیر کی مختلف ڈیپارٹمنٹل سٹورز وغیرہ میں گئے۔ ہم نے ساڑھے تین بجے مچھلی اور اُبلے چاولوں سے پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد Cruise کے لیے تیاری کی۔ کروز ٹرمینل پہنچنے پر ہمارا اچھی طرح استقبال کیا گیا۔ ہمارے کیبن کی چابیاں ہمارے حوالے کی گئیں اور نفیسہ نے ڈاکٹر سے دوا لی۔

پورا دن ہم Cruise Ship پر رہے اور Yangtese دریا کے خوب صورت کناروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد ایک جگہ ٹھہرے اور Pagoda کی سیر کی۔ یہ جگہ 1986ء سے ایک جزیرہ بنی ہوئی اور صرف Pagoda بچا ہے۔ سب مکانات دریابُرد ہو چکے ہیں۔ ساری رات ہمارا جہاز Cruise کرتا رہا۔ اگلی صبح ایک دفعہ پھر 6:45 جاگ کر Tai Chi کی کلاس میں حصہ لیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد Quang Gorge سے خوبصورت پہاڑوں کا نظارہ کیا۔ اب لنچ کے بعد میں باہر ڈیک پر بیٹھ کر خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہمارا جہاز رُکے گا اور ہم دو، تین گھنٹے کے لیے Excursion پر جائیں گے۔ اُس سے اگلے دن صبح سویرے ہم نے اپنے چاروں آسٹریلین ساتھیوں کے ساتھ ناشتہ کیا؛ کرکٹ اور برطانوی سیاست پر گپ شپ کے بعد Tour Director Steven اور سٹاف کو گُڈ بائی کرنے کے بعد بس میں سوار ہوئے۔ گائیڈ 22 سالہ CoCo نے استقبال کیا اور سب کو مطلع کیا کہ 3 Gorges Dam کا بنیادی مقصد 30 بلین کی چینی آبادی کو آنے والے سالوں میں سیلاب سے بچانا تھا۔ اس کے ساتھ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ سولہ Turbine امریکہ، فرانس، جرمنی اور سویڈن سے خرید کر بجلی پیدا کی۔ بارہ Turbines اس کے بعد China نے خود تیار کیں۔ 28 Turbines سے اتنی بجلی سالانہ پیدا ہو رہی ہے کہ پورے آسٹریلیا کی بجلی کی ضرورت صرف یہ Dam پوری کرسکتا ہے۔

ہماری گائیڈ Coco نے یہ بھی بتایا کہ تقریباً 15 لاکھ کی مقامی آبادی کو نقل

مکانی کرنی پڑی۔ حکومت نے دو طرح کی پیش کش مقامی آبادی کو دی۔ پہلی؛ وہ مقامی طور پر اونچی جگہ ایک بڑا گھر بنا لیں اور خرچہ حکومت چین برداشت کرے گی۔ دوسری؛ وہ بیجنگ، شنگھائی یا صنعتی شہروں میں چلے جائیں جہاں پر بہتر ملازمت اور معیارِ زندگی حاصل کر لیں۔ مقابلتاً چھوٹا گھر ان شہروں میں اُنھیں دے دیا جائے گا۔ Eichang کا علاقہ چائے اور مالٹے کے لیے مشہور ہے۔ اس ڈیم میں جہاز رانی کا بندوبست بھی ضروری تھا Yangtese دریا بڑے بڑے بحری جہازوں کے استعمال میں ہے۔ سو حکومت نے جہازوں کے لیے Elevator کا بندوبست بھی کر رکھا ہے۔ جہاں پر بحری جہاز کو مختلف Locks میں زیادہ پانی چھوڑ کر پانچ Stages پر اُونچا کر کے یا نیچا کر کے ڈیم کے دائیں حصے سے جو ڈیم سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہے گزارا جاتا ہے۔

Excrusion کے ختم ہونے پر ہماری بس ٹورسٹ سنٹر پہنچی۔ ہم نے بشمول آسٹریلین سب کو بائے کہا۔ ٹیکسی سے اپنے ہوٹل روانہ ہوئے اور رات گزاری۔ یہ Eichang ایک پرانا علاقہ ہے۔ رات کو ہم نے کوشش بسیار کے بعد ایک ریسٹورنٹ ڈھونڈا جہاں وہی مچھلی کھائی جو پہلے ہم Chongging میں کھا چکے تھے۔ آلو کی ڈش جو اس سے قبل کاشغر میں کھائی وہی دوبارہ کھائی۔ یہ آلو کاشغر والے آلو سے نسبتاً کم مزے دار تھے۔

صبح سویرے ہم نے ناشتے کے لیے باہر جانے کا ارادہ کیا اور ایک بیکری میں کرانساں بسکٹ اور کافی سے ناشتہ کرنے کے بعد تھوڑی دور گھومنے نکلے اور پھل وغیرہ خریدا۔ جب واپس ہوٹل کے لیے ایک دوسری سڑک سے واپس آ رہے تھے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ پر لفظ حلال لکھا دیکھا۔ وہاں پر کام کرنے والے آدمی کے سر پر ٹوپی دیکھی اور عورت کا سر ڈھکا ہوا پایا۔ میں نے انہیں سلام کہا جس کا اُنہوں نے جواب دیا۔ میں اور نفیسہ یہ سوچ کر گزرے کہ اگر ذرا بھوک ہوئی تو جانے سے پہلے ان سے لنچ خریدیں گے۔ افسوس کہ ہماری یہ

خواہش وقت کی قلت کے باعث ادھوری ہی رہی۔ ہم ٹیکسی پکڑ کے ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہوئے؛ایک دفعہ پھر Yiling Yangtese پُل کا نظارہ کیا جو ایک خوبصورت پُل ہے۔ اب ہم سٹیشن پر اپنی ٹرین کے انتظار میں بیٹھے تھے۔تھوری دیر میں ہماری ٹرین Zhangjiajie کی طرف روانہ ہو گی جہاں ہم نے تین دن گزارنے ہیں۔

ہماری ٹرین Zhangjiajie سٹیشن پر تقریباً 20 منٹ تاخیر سے 7:30 پر پہنچے گی۔ یہ پہلی بار ہم نے دیکھا کہ ٹرین لیٹ ہوئی۔ سٹیشن پر Lee ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ ہمیں کار پارک میں اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے ہوٹل لے گیا۔ ہمیں آفر کی کہ اس کے دونوں ہوٹلوں میں (جو ساتھ ساتھ ہی تھے۔) جہاں چاہیں قیام کر لیں۔ ہم نے پہلے ہی ہوٹل میں قیام کا فیصلہ کیا اور کمرے میں سامان رکھنے کے بعد باہر رات کے کھانے کے لیے نکلے تو 'میکڈونلڈ' Fillet Fish اور Fries پر ہی اکتفا کیا کیونکہ حلال ہوٹل ہمیں نہ مل سکا۔

ہم Mountain-Tianmen کے لیے روانہ ہوئے تو پتہ چلا کہ چیئر لفٹ کام نہیں کر رہی اور ہمیں چھوٹی بس پر جانا پڑے گا۔ کوسٹر ٹائپ بس میں پہاڑی کا مشکل اور صبر آزما سفر کیا۔ چونکہ دھند اور کہرا تھا اس لیے پہاڑ صاف نظر نہیں آرہے تھے۔ ہم نے دن کا بیشتر حصہ پہاڑ پر گزارا۔ واپسی بس پر پہاڑ سے نیچے اُترے اور پھر بس بدل کر واپس Zhangjiajie پہنچے۔ آرام کیا کھانے کے لیے چیز اور ٹماٹو پیزا سے گزارا کیا۔

7 نومبر ہم صبح سویرے ہی جاگ گئے Wuliyian پہاڑ کی طرف ایک منی بس میں روانہ ہوئے۔ خاصے پیدل سفر کے بعد ہم Tourist Center سے ٹکٹ خریدنے کے بعد بس کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو ایک چینی عورت ہمیں بار بار بطور Tour Guide اپنی خدمات پیش کرتی رہی۔ یہ National Park وسیع وعریض پارک ہے۔ اس میں مشہور ہالی وڈ فلم Avatar کی عکس بندی کی گئی تھی۔ ہمیں کم از کم چھ سے

سات بار بس میں بیٹھنا ہے؛ Mini Rail کا سفر کرنا ہے؛ بہت اُونچی پہاڑی لفٹ میں بیٹھنا ہے اور واپسی کا کچھ حصہ Chair Lift کے ذریعے پہاڑ سے اُترنا ہے۔ اس لیے اس خاتون جس کا نام Shewshin تھا کی خدمات حاصل کر لیں۔ جو بہت اچھا فیصلہ تھا ورنہ ہم سارے قابلِ ذکر مقامات دیکھ نہ سکتے اور نہ ہی 7 بجے شام کو واپس ہوٹل پہنچ کر 10:30 کی شام کی بیجنگ کی فلائٹ پکڑ سکتے۔ یہ پہاڑ دنیا کے انوکھے پہاڑ ہیں کیونکہ یہ چھوٹے چھوٹے اور بہت لمبے لمبے کھمبوں یا Poles کی طرز کے ہیں بعض کی شکلیں عجیب وغریب ہیں جن کو چینی لوگوں نے مختلف نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً اونٹ Double Hump، تین بہنیں، انگلی شہادت، ایک فیملی شہزادی پھول تقسیم کر رہی ہے وغیرہ۔ ان پہاڑوں میں بندروں کی بھی خاصی آبادی ہے۔

بس میں مجھے ایک ہی سیٹ ملی جو ایک درمیانی عمر کی چینی عورت کے ساتھ تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ ہماری آگے والی سیٹ سے ایک عورت اپنے فون پر ہم دونوں کی تصاویر بنا رہی ہے۔ پھر ساتھ والی عورت کو دکھا کر محظوظ ہو رہی تھی؛ میرے ساتھ بیٹھی عورت ان کو کچھ اور ہدایات دے رہی تھی کہ مزید تصاویر اور ویڈیو بناؤ۔ وہ خوب زور زور سے قہقہے لگا رہی تھیں جن کو ہماری گائید نے اور نفیسہ نے بھی نوٹس کیا۔ میں نے اُنہیں جی بھر کے فوٹو بنانے کی اجازت دی اور سفر بخوبی گزر گیا۔ ٹور کے خاتمے پر ہم نے ٹیکسی لی ڈرائیور ہماری گائیڈ کا کلاس فیلو تھا اور واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ Lee نے مین روڈ پر آ کر ہمارے لیے ٹیکسی کی اور کرایہ Fix کیا پھر ہمیں خدا حافظ کیا؛ ہم اس کے شکر گزار تھے۔ ہماری فلائٹ 1 بجے علی الصبح بیجنگ لینڈ کر گئی ؛ ہم نے ٹیکسی لی اور ہوٹل پہنچ گئے۔ یہ چین میں پہلا اتفاق تھا کہ ہمارا ٹیکسی ڈرائیور اچھا آدمی تھا اور نہ ہی اچھا ڈرائیور۔

ہم بذریعہ Subway سفر کرتے ہوئے Tianamen East کے سٹیشن پر اُترے۔ باہر نکلے تو سامنے ہی ایک مشہور Palace نظر آ گیا جس پر ماؤزے تنگ کی

تصویر آویزاں تھی۔ تھوڑے فاصلے پر باوردی محافظ تھے اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ سڑک نہایت ہی وسیع تھی اور بڑی بڑی جدید عمارات بتارہی تھیں کہ یہ بیجنگ کا دل ہے۔ ہم Palace کے دروازے سے داخل ہوئے تو چند سو گز کے فاصلہ میں ایک اور محل تھا۔ دائیں بائیں بھی عمارات ملحق تھیں۔ تھوڑی دور جا کے ہم نے ٹکٹ خریدی اور الیکٹرانک گائیڈ لیا تو پتہ چلا کہ ہم اب Forbiden City میں داخل ہو رہے تھے جو ایک نہ ختم ہونے والے محلوں کا سلسلہ ہے کم از کم سات محل درمیان میں ایک کے بعد ایک آئے۔ دائیں اور بائیں جانب کے محلوں اور عمارتوں کا شمار رکھنا مشکل تھا۔ مختصراً یہاں شاہی خاندانوں کے دفاتر اور محلات تھے جو کئی صدیوں تک چین کے مختلف شاہی خاندانوں نے بنائے اور استعمال کیے۔ شام کو بیجنگ کے پاکستانی خان بابا ریسٹورنٹ پر کھانا کھایا۔

اگلے روز تھکاوٹ کے باعث ہم نے چھٹی منائی۔ نفیسہ نے اپنی امی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خریداری کا پروگرام بنایا اور تقریباً سارا دن سلک مارکیٹ میں شاپنگ کی۔ وہیں پر موجود ایک حلال پاکستانی انڈین، بنگلہ دیشی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے اور Haagen Das کی Concession سے آئس کریم کھانے کے بعد شام ہوٹل پہنچے۔ کل Tiananmen Square اور پارک میں سیر کا پروگرام ہے۔ سلک مارکیٹ کی خاص بات جو ہمیں ہوٹل والوں نے بتا دی تھی کہ جو قیمت مانگی جائے اُس سے آدھی سے کم پر بھی سودا ہو جائے گا اور ہمارا تجربہ ایسا ہی رہا۔ ہم نے مانگی گئی قیمت کا بمشکل 20 یا 25 فیصد دیا۔

آج صبح میں نے ہوٹل میں ہی گزاری۔ نفیسہ چائے مارکیٹ سے اپنے لیے مختلف قسم کی چائے اور چائے بنانے کے لوازمات خرید کر لائی۔ دوپہر کے بعد ہم کل اور آج کے خریدے ہوئے سامان کو ایک Packet میں رکھ کر چائنہ پوسٹ دفتر گئے اور وہاں پر ایک نہایت ہی مددگار چینی عورت نے سارا سامان چیک کیا۔ نفیسہ کو بتایا

کہ ٹی پاٹ مسئلہ پیدا کرسکتا ہے اس لیے اُسے نکال لیا جائے۔ پھر اُس نے نہایت مہارت سے سامان کو پیک کیا اور ہمیں رسید دے کر رخصت کیا۔ آج ہمارا Uighur حلال کھانے کا پروگرام تھا اور ایسے ہی ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور جلدی سو گئے۔ کیونکہ کل صبح 6 بجے سے پہلے جاگ کر دیوارِ چین کے ٹور پر جانا تھا۔

صبح سویرے جاگ کر ہوٹل کے ایک ملازم کے ساتھ مین لابی میں آئے اور ایک بس میں سوار ہو گئے۔ ہمارے ہوٹل کے چھ سات اورسیاح ہمارے ہمراہ تھے۔ ہماری بس دو دفعہ رُکی اور مزید ٹورسٹ کو بٹھایا گیا۔ اس کے بعد بس ایک بار پھر رُکی اور تھوڑی دیر بعد ایک درمیانی عمر کا آسٹریلین مرد اور دو Blonde لڑکیاں جن کی عمریں آٹھ نو سال کے لگ بھگ تھیں ایک ٹیکسی سے سے اُتریں اور ہماری بس میں سوار ہوگئیں۔ ہماری بس تقریباً دو گھنٹے کی بیجنگ سے مسافت کے بعد رُکی اور ٹور گائیڈ نے باقی ہدایات دیں۔سب کو بتایا کہ چونکہ دیوارِچین خاصی بلندی پر ہے اس لیے بجائے پہاڑ پر چڑھنے کے کیبل کار سے اُوپر جائیں۔پوری دیوارِ چین کے سفر کا ارادہ مت کریں کیونکہ دیوارِ چین کی کل لمبائی تقریباً 6 ہزار کلو میٹر ہے جو اسلام آباد سے برمنگھم کے بائی ایئر فاصلے کے برابر ہے۔ اس لیے دیوارِ چین کے مغربی حصے کی طرف جائیں؛ پہاڑ کی چوٹی کا جا کر نظارہ لینے کے بعد واپسی کا رُخ کریں اور تین گھنٹے کے اندر اندر واپس فارم ریسٹورنٹ پر آکر لنچ کریں۔ اس طرف آپ کو ساڑھے چھ ہزار سیڑھیاں طے کرنا ہیں اور پھر واپس بھی آنا ہے۔ دوسری طرف بھی آپ جا سکتے ہیں جو تھوڑا آسان ہے اور واپسی پر آپ ایک نہایت ہی تیز رفتار Sledge سے نیچے آسکتے ہیں۔ نفیسہ نے اس طرف کا رُخ کیا اور میں نے مغرب کی طرف رُخ کیا۔

میرے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ دیوارِ چین کی 6 ہزار کلو میٹر لمبائی میں دشوار گزار پہاڑوں کے اوپر تقریباً15 سے 18 فٹ چوڑی دیوار جو دو ہزار سال پہلے

شروع کی گئی تھی۔ تقریباً 700 سو سال آج سے پہلے مکمّل ہوئی یعنی 1300 سال کا عرصہ جس میں مختلف حکومتیں آتی رہیں۔ یہ دیوارِ چین اس قوم کی جاں فشانی، اعلیٰ ہمتی، حُب الوطنی، دُور اندیشی اور ارادے کی پختگی کی ایک نایاب مثال ہے۔ دیوارِ چین کے دونوں طرف تیر اندازوں اور رائفل کے حملے سے بچاؤ کے ساتھ ساتھ نیچے چھوٹے چھوٹے طاق نما سوراخ بھی بنے ہوئے ہیں جن سے خوب نشانہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک قلعہ نما بُرج ہے جس کے اندر فوجی ساز و سامان حرب رکھنے کے ساتھ ساتھ سردی سے بچنے کے لیے انگیٹھیاں بھی بنائی گئی ہیں۔

تقریباً ایک بجے ہم واپس ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے؛ دوپہر کا کھانا کھایا اور واپس بیجنگ کے لیے بس روانہ ہوئی۔ جاتے وقت تو زیادہ سفر ہائی وے سے گزرا تھا مگر واپسی پر بس ایک اور راستے سے آئی تو ہمیں بیجنگ کی وسعت کا اندازہ ہوا کہ یہ دنیا کے چند بہت ہی بڑے شہروں میں سے ایک شہر ہے۔ یہاں بھی چین کے باقی بڑے شہروں کی طرح بڑے بڑے ٹاور بلاک آباد ہیں۔ شہر کی سڑکوں کی وسعت نے بھی متاثر کیا۔ تھکے ہارے ہوٹل پہنچے اور آرام کے بعد شام کا کھانا ایک بار پھر پاکستانی ریسٹورنٹ خان بابا پر کھایا۔ واپسی پر سامان کی پیکنگ بھی کی کیونکہ صبح سویرے ہی بیجنگ کے سنٹرل سٹیشن پہنچ کر منگولیا کے لیے ٹرین پکڑنی ہے۔

آج ہم پانچ بجے جاگ کر تیار ہوئے اور ہوٹل ریسیپشن کو ٹیکسی کے لیے کہا اور سامان لے کر سنٹرل سٹیشن پہنچ گئے۔ سامان وغیرہ کی چیکنگ کے بعد ہمیں 40 منٹ روانگی سے پہلے انٹرنیشنل ٹرین ہونے کی وجہ سے پلیٹ فارم پر پہنچنا ہے۔ ہم وقت پر پہنچ گئے اور اپنا فرسٹ کلاس کا کیبن دیکھ کر تسلّی ہوئی۔ یہ دو بستروں پر مشتمل ایک کمرہ نما کیبن تھا۔ ایک آرام دہ کرسی، میز، شاور، سنک اور باتھ روم تھا۔ یہ سب تو تسلّی بخش تھا مگر کیبن ٹھنڈا تھا۔ ہمیں جو کمبل دیے گئے تھے اُن میں سے ایک اوڑھنا پڑا۔ اٹنڈنٹ کو بار بار یاد دلانے کے باوجود کمرہ ٹھنڈا ہی رہا۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد

Heating نے آہستہ آہستہ کام شروع کیا۔ پہلا سٹیشن جہاں پر ہماری ٹرین رُکی وہ Zhangjanko South تھا۔ نفیسہ سو رہی ہے؛ ہماری ریل کے سفر کو چار گھنٹے ہوئے ہیں اور کم از کم 26 گھنٹے کا سفر باقی ہے۔

اس وقت ہم کسانوں کے علاقے سے گزر رہے ہیں۔ باہر مکئی کی فصل کاٹی جا چکی ہے۔ سردیوں میں فراسٹ سے بچنے کے لیے نائلون کے نیچے موسم سرما کے پھل یا سبزیاں لگائی جا رہی ہیں۔ چین نے اپنے ٹرانسپورٹ سسٹم پر بہت توجہ دی ہے اور سرمایہ کاری کی ہے جس کی وجہ سے ریل اور شاہراؤں کا نظام مغربی یورپ اور امریکہ سے بھی بہتر نظر آتا ہے۔ جس علاقے سے ہم تقریباً دو گھنٹے سے گزر رہے ہیں۔ فیکٹریوں اور ان سے اُٹھنے والے دھوئیں سے یہ بات عیاں ہے کہ چین اس وقت آلودگی پھیلانے والے ممالک میں پہلے یا دوسرے نمبر پر ہے۔ ہماری ریل گاڑی تیزی سے منزل کی طرف رواں دواں ہے اس کا آخری سٹاپ Moscow ہے۔ چین نے چیڑ کے پودے لگائے ہیں جو آئندہ سالوں میں پہاڑیوں کو خوبصورتی بخشنے کے علاوہ ماحولیاتی آلودگی سے بچنے کا سبب بھی بنیں گے۔

آج بیوی بچوں اور اُن کے بچوں کی یاد ستا رہی ہے اور ان سب کی کمی محسوس کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کر سکتا کہ اُس کا کرم مجھ جیسے ناکارہ بندے پر ہے۔ اُس پاک ذات کا وجود ہر ذرّے میں موجود ہے۔ یہ سب کائنات پیدا کی؛ پھر انسان کو کیا کیا عطا کیا کہ ہر دم ہر سانس اُسی کے پیدا کردہ عناصر پر ہمارا گزارا ہے۔ یہ عقل مند بنی آدم دنیا کو ہر لمحہ بہتر سے بہترین کرنے میں اُسی کی ذات پاک کے مرہونِ منت ہونے کے باوجود نہ صرف انکاری ہے کہ ''انسان فانی ہے'' کی حقیقت کو بھی بھلا بیٹھا ہے۔ اللہ عزوجل سے ملتمس ہوں کہ مجھے پر کرم فرمائے اور مجھے حقیقت جاننے کا فہم عطا فرمائے۔ آمین!

ہمیں ابھی سفر کرتے ہوئے پونے پانچ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ ہمارے دائیں

طرف دیوارِ چین کا حصّہ نظر آرہا ہے جس میں شکست و ریخت کے آثار ٹرین سے ہی نظر آرہے ہیں۔ بنیادی طور پر دیوارِ چین کی ابتدا منگول قبائل کے حملے کے بچاؤ کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ دو ہزار سال پہلے چین ایک مہذب ملک تھا اور منگول نہایت ہی Barbaric قسم کے لوگ تھے اور لڑنا اور لوٹ مار ان کا کام تھا۔ یاد رہے کہ چین ہی نے دنیا کو حساب کتاب بذریعہ Abacus، کاغذ کی ایجاد اور گن پاؤڈر دیا تھا۔

ہماری ریل گاڑی کو سفر شروع کیے ہوئے 12 گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے صرف تین سٹیشنوں پر بمشکل 15 منٹ فی سٹیشن رُکنے کے علاوہ مسلسل سفر طے کرتے جارہے ہیں۔ ابھی تک چین میں ہی ہیں اور منگولیا بارڈر نہیں آیا۔ پہلے دو گھنٹے سردی میں گزرے تھے اس کے بعد آہستہ آہستہ Heating شروع تو ہوئی مگر ٹھنڈی ہوا ہمارے کیبن میں مسلسل روشن دان سے پورے زور سے آرہی تھی۔ اس وجہ سے کیبن ٹھنڈا ہی رہا تیسری بار اصرار کرنے پر چائنیز کنڈکٹر نے ایک انجینئر کو بلوایا اور اُس نے کہا میں یہ ٹھنڈی ہوا کم کرتا ہوں اور اس نے وہی کیا تو ہمارا کیبن گرم ہوگیا۔ ہماری خوشی تھوڑی دیر ہی رہی کہ کنڈکٹر صاحب آئے اور ساتھ اپنے کینیڈین جوڑے کو لائے۔ یہ لوگ ہمارے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور کل دیوارِ چین پر بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ کینیڈین جنٹل مین نے بتایا کہ اُن کا کمرہ تندرو کی طرح گرم ہوگیا ہے۔ اس پر کنڈکٹر نے ہمیں اُن کے ساتھ والا خالی کیبن آفر کیا۔ ہم نے یہ سوچتے ہوئے قبول کر لیا کہ اس طرح ہم اپنے ساتھیوں کو تکلیف سے بچاتے ہوئے خود بھی آرام سے رہیں گے۔ مگر پانچ چھ گھنٹے ہو چکے ہیں ہمارا اور اُن کا بھی کیبن تندور بنے ہوئے۔ کنڈکٹر نے کوئی حل نہیں نکالا سوائے اس کے کہ گینگ وے کی ایک کھڑکی کھول دی ہے جس سے یخ ہوا اندر آتی ہے۔ ہم دونوں کیبن کے دروازے کھلے رکھتے ہیں تاکہ گرم ہوا باہر جائے اور ٹھنڈی ہوا اندر آئے۔ وقتاً فوقتاً جب زیادہ ٹھنڈک ہو جاتی ہے تو کھڑکی بند کر دیتے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد پھر کھڑکی کھول کر گزارہ کر

رہے ہیں۔

خدا خدا کر کے 8:00 بجے رات کو ہماری ٹرین چین کے آخری سٹیشن پر رُکی۔ فرسٹ کلاس کے چار مسافروں یعنی ہم باپ بیٹی اور دونوں کینیڈین کو چھوڑ کر سب لوگ مع سامان اُتر گئے۔ ایک بڑے سے ہال میں ان کی کسٹم اور امیگریشن وغیرہ بڑی تفصیل سے شروع ہو گئی۔ ہمیں کنڈکٹر نے بتایا کہ اُترنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کینیڈین جنٹل مین نے بتایا کہ ٹرین یہاں چار گھنٹے رُکے گی۔ نفیسہ مجھے ایک دن پہلے کہہ رہی تھی کہ بارڈر پر ٹرین کے ویل بدلیں گے جس میں خاصا وقت لگے گا۔

ہم انتظار کرتے رہے پہلے گھنٹے میں چینی الیکٹرک انجن کو اُتار کر روسی ڈیزل انجن لگایا گیا جس کے بعد ٹرین صرف ہم چار مسافروں کو لے کر چل پڑی تو ہم لوگ حیران ہوئے۔ تقریباً آدھ میل کے بعد پوری ٹرین ایک ورکشاپ میں داخل ہوئی جس میں تقریباً ہر دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر بڑے بڑے بجلی کے Jack جیسے کار اُٹھانے والے ہوتے ہیں نصب تھے۔ کئی بار ٹرین جھٹکے کھاتی کبھی آگے جاتی کبھی پیچھے جاتی رہی۔ رات گیارہ کے قریب ہم بستر پر لیٹ گئے ؛ ایک دو چینی آفیسر اور دو تین منگولین حکام کیبن میں آئے پاسپورٹ اور سامان دیکھا ؛ چلے گئے پھر پاسپورٹ واپس کر گئے اور ہم سوتے جاگتے رہے۔

نفیسہ کہتی ہے کہ میں نے یہاں کے بوڑھے چینی مسلمانوں کو پُر سکون، بڑے دل والے اور غنی پایا۔ کاشغر شہر کا پرانا حصّہ نہایت ہی خوب صورت ہے۔ مگر مجھے یقین ہے اور دُکھ بھی کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کی کہانیاں صحیح ہوں گی۔ اتنی سخت پابندیاں اور کیمروں کی بہتات کے علاوہ دو ہفتے کے دوران میں اتنے بڑے صوبے میں ہمیں ایک بھی کھلی مسجد کا میسر نہ آنا اس بات کی ایک ٹھوس دلیل بھی ہے۔ چین کی

ترقی کا راز اُن کا طرزِ حکومت ہے جو اس مُلک کو مستقبل میں سپر پاور بنا دے گا۔ نفیسہ کو اُن کے طور طریقے سے سخت اختلاف ہے۔ وہ کہتی ہے اگلے بیس پچیس سال میں دیکھوں گی کہ کیا واقعی یہ ملک مکمّل سُپر پاور بن سکے گا؟ اور بحیثیت سُپر پاور کتنی دیر تک اپنی ساکھ بحال رکھے گا۔

دردِ دل کے واسطے

آج کی سہانی صبح کا آغاز منگولیا میں ہوا ہے۔ سورج ابھی نکلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ ہاتھ منہ اور دانت صاف کر کے اپنی کرسی پر آبیٹھا ہوں۔ سب سے پہلا خیال یہی آیا ہے کہ کیا واقعی میری والدہ ماجدہ کی نسل اس دھرتی سے ہے؟ اللہ بخشے فرمایا کرتی تھیں کہ چغتے نسل کی مغل ہیں۔ یہاں کی ہموار زمین تقریباً صحرا نما ہے۔ صرف جنگلی گھوڑوں کے دو ریوڑ دیکھنے کے کوئی اور جانور نظر نہیں آرہا۔ تقریباً 10 میل کے سفر میں کہیں بھی کسی قسم کی مستقل یا عارضی آبادی نظر نہیں آئی۔

ریل کی پٹڑی کے متوازی تقریباً ایک میل کے فاصلے پر سڑک ہے جس پر گاہے بگاہے کوئی چھوٹی یا بڑی گاڑی گزرتی ہے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ہی مسلسل ٹیلی فون کی لائن بچھائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تا حدِ نگاہ صحرا ہی صحرا ہے اور یہ گوبی صحرا کا حصّہ ہے۔ دو تین جگہ پانی نظر آیا اور وہ بھی منجمد۔ یہ جگہ دنیا کے سرد ترین مقامات میں سے ہے۔ ہمارا سفر تقریباً دو گھنٹے بعد ختم ہو جائے گا۔ منگولیا کا سارا علاقہ صحرائی ہے اور اتنی شدید سردی ہے کہ بیشتر ریت منجمد ہے اور برف کی طرح سفید ہے۔ جگہ جگہ جنگلی گھوڑے، گائے اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کوّا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں دو چار جنگلی کبوتر نظر آتے ہیں اور اِکّا دُکّا باز بھی دکھائی

دیتا ہے۔

منگولیا کا کم از کم یہ حصّہ نہایت ہی پسماندہ ہے۔ مکانات سوویت یونین کے دور کے نظر آتے ہیں جو نہایت بوسیدہ ہیں۔ یہاں زندگی خاصی مشکل اور معیار زندگی بہت پست نظر آتا ہے۔ کینڈین جوڑے نے بتایا کہ وہ چند دن بیجنگ گزار کر اب Ulaanbaatar چار دن رہیں گے۔ بذریعہ ریل Trans Siberian سے ماسکو اور پھر سینٹ پیٹرز برگ سیر کرنے کے بعد مونٹریال پرواز کر جائیں گے۔

ہمارا سفر منگولیا سے واپس چین اور پھر قازقستان کا ہوگا۔ آخر کار تین بجے کے بعد دوپہر کو ہماری گاڑی Ulaanbaatar جس کو مقامی لوگ لمباٹا بولتے ہیں کے سٹیشن پر رُکی اور ہم سامنے جا کر پلیٹ فارم پر اُترے۔ دوتین لوگوں نے ہماری توجہ ٹور گائیڈ پمفلٹ کی طرف کرانے کی کوشش کی مگر ہم ابھی اپنے سامان کی طرف دھیان کیے سٹیشن سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے باہر آکر ATM کی تلاش میں ایک دوسرے حصے کی طرف جانا پڑا۔ جہاں ایک ATM پر کینڈین جوڑا ہم سے پہلے لوکل کرنسی نکلوانے میں دِقت کا سامنا کر رہا تھا۔ بہر حال ہم ایک دوسری ATM پر گئے۔ نفیسہ کے کارڈ سے رقم نکلوانے میں ناکامی کے بعد میں نے اپنا کارڈ استعمال کیا۔ 20,000 کی مقامی کرنسی نکال لی مگر وہ صرف ایک نوٹ پر مشتمل تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ صرف سات پونڈ کی Value کا نوٹ تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور ایک گائیڈ نے ہمیں ہوٹل تک ٹیکسی کی آفر کی اور کرایہ چار ڈالر بتایا تو ہم راضی ہوئے۔ اُنہوں نے ہمارا سامان گاڑی میں رکھا اور نوجوان لڑکی نے ہمیں ٹور گائیڈ کی خدمات مع ٹیکسی اور لنچ ایک سو ڈالر میں پیش کیں جو ہم نے اُسی وقت تو نہیں لیکن چار گھنٹے بعد منظور کر لیں۔

رات کو ہم نے ٹیکسی منگوائی اور حلال ریسٹورنٹ کے لیے ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ایک مقام پر ٹیکسی ڈرائیور جو ایک بھاری بھرکم عورت تھی نے ٹیکسی روکی اور ہمیں اُترنے کو کہا چونکہ ہوٹل ریسٹورنٹ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم نہ اُترے اور اسے بتایا کہ یہ

ہماری منزل نہیں۔ بمشکل اُس کو کہا کہ واپس ہوٹل فون کرو اور ہماری بات کراؤ تا کہ ہم اُنہیں بتائیں کہ ریسٹورنٹ نہیں ہے۔ اُس نے ہوٹل والوں سے مزید ہدایات لیں اور گاڑی دوسری سڑکوں سے گھما کر پھر وہیں رُک گئی تو میں نے اُسے ریسٹورنٹ کا نمبر اپنے فون پر دیا اور کہا کہ ان کو فون کرو اور ایڈریس لے لو۔ اُس نے غصّے سے اُن کو فون کیا اور ہمیں اشارے سے بتایا کہ ناممکن ہے۔ میں نے خود فون پر دوسری لڑکی سے بات کی وہ انگریزی بول سکتی تھی تو پتہ چلا کہ ریسٹورنٹ چند ماہ قبل بند ہو چکا ہے۔ میں نے اُس سے کسی اور حلال ریسٹورنٹ کا پوچھا تو اُس نے کہا کہ ہزارہ حلال ریسٹورنٹ ہے۔ میں نے اُسے کہا پلیز ہماری ڈرائیور کو اُس کا پتہ سمجھا دو جو اس نے بتایا تو ڈرائیور بڑبڑاتے ہوئے گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کے تیور سے ہمارا اندازہ تھا کہ یہ ہمیں واپس ہوٹل اُتارے گی اور شاید ریسٹورنٹ جانے کی تکلیف نہ کرے مگر ہمارا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ہم کھانا کھا کر ہوٹل سو گئے۔

صبح اُٹھ کر ناشتہ کرنے کے بعد 9 بجے ہم ہوٹل لابی پہنچے تو ہماری درمیانی عمر کی گائیڈ انتظار کر رہی تھی اور ساتھ ہی ایک ڈرائیور اس منی وین کے باہر انتظار کر رہا تھا۔ ہمارا سفر شروع ہوا چونکہ باہر سخت سردی تھی اور برف باری بھی تھی اس لیے احتیاط کی ضرورت تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اُونچے مقام پر گاڑی رُک گئی۔ ہم اُترے تو ہماری گائیڈ نے بتایا کہ یہ مقام سوویت منگولیا کی دوستی کی یادگار ہے اور تاریخی مقام ہے۔ ہمیں تقریباً ڈیڑھ دو سو کے قریب سیڑھیاں عبور کرنی تھی برف سے پھسلن کا اِمکان بھی موجود تھا۔ بہر حال ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے تو ہماری گائیڈ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مدد کرنا چاہی؛ میں نے معذرت کر لی کیونکہ مجھے یہ مناسب نہیں لگتا تھا۔ بے شک نفیسہ کے لیے یہ ایک مذاق بن گیا۔

ہماری گائیڈ نے بتایا کہ گورنمنٹ لوگوں کو مفت پلاٹ دیتی ہے۔ لوگ اپنی مرضی اور حیثیت کے مطابق شہر سے دور تھوڑا باہر مکان بنا سکتے ہیں اور وہ بھی یہی کر

رہی ہے۔ مکان مع گیراج بنا رہی ہے کیونکہ شہر کا فلیٹ اُس کی فیملی کی ضرورت کے لیے کافی نہیں۔ اُس نے بتایا کہ منگولیا کی کل آبادی 32 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے مگر رقبہ گوبی صحرا بشمول بہت بڑا ہے۔ کل آبادی میں سے صرف 12 لاکھ لوگ لمباٹا میں رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس شہر کو چھوڑ کر کل آبادی صرف 20 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

ہماری گاڑی شہر سے باہر کی طرف نکل رہی تھی اور آباد علاقہ ختم ہو رہا تھا۔ ہم چنگیز خان (تیمور دین) کی یادگار پر پہنچ گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ سٹین لیس سٹیل کا مجسّمہ دنیا میں سب سے بڑا ہے اور گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی ہے۔ وہاں پر ایک بہت بڑا بوٹ ہے جو 80 گائیوں کے چمڑے سے بنا ہے اور اس بوٹ کا کل وزن ساڑھے تین ٹن ہے۔ یہ ایک اچھا یادگار میوزیم ہے اور منگولوں کی تاریخ بھی جگہ جگہ درج ہے۔ جب ہم سوویت منگولین کی یادگار سے اُترے تو میں نے گائیڈ سے چغتائیوں کے متعلّق پوچھا تو وہ مجھے کچھ نہ بتا سکی۔ اس نے کہا وہ نہیں جانتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کے چہرے پر کچھ سوچ کے آثار تھے اور کہنے لگی صرف چغتے ہیں۔ وہ چنگیز خان کے ایک بیٹے Tsaagar کو منگولیا میں کہتے تھے۔ وہ چنگیز کا غالباً دوسرا بیٹا تھا اور اُس کی بادشاہت سمرقند، بخارا، افغانستان اور پاکستان کے کچھ حصّوں پر مشتمل تھی جن میں سے اکثر Unighar قبائل تھے۔ میوزیم میں ہم نے زیادہ معلومات لی اور ایک نہایت قیمتی کتاب تقریباً 270 ڈالر میں خریدی جو مغلوں کی تاریخ کے حوالے سے تھی۔

اس کے بعد ہم ایک جگہ GER جو Unighar کا گھر ہوتا ہے جو گول تنبو کی شکل میں ہوتا ہے۔ وہاں پر حسبِ ضرورت لنچ کے لیے پہنچے تو پتہ چلا کہ اُس کے گھر والے قازقستانی مسلمان ہیں۔ ہم نے گائیڈ کو بتایا ہوا تھا کہ ہم کسی قسم کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ گھر مسلمانوں کا نکلا اور خاتونِ خانہ نے بتایا کہ

گائے کا گوشت حلال ہے۔ ہم نے ان کی گھر کی بنائی ہوئی پیسٹری، مکھن، سفید چاول، گائے کا نمکین گوشت اور دودھ پتی قسم کی چائے سے لنچ کیا۔ دوسرے GER میں مقامی لباس میں چند فوٹو بنوائے۔ خاتونِ خانہ نے کہا اگر آپ رات کا انتظار کریں تو میرا خاوند جو دو سال ترکی میں دینی تعلیم بھی حاصل کر چکا ہے آپ سے مل کر خوش ہو گا۔ وقت کی قلّت کی وجہ سے ہم نہ رُک سکے۔ میں نے غیر محسوس انداز سے خاتون کو کچھ ڈالر دیے تاکہ ٹور والے اُس سے حصہ نہ مانگ لیں۔

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

اس کے بعد ہم ایک مقام پر گئے جہاں نفیسہ نے تقریباً پونا گھنٹہ گھڑ سواری کی اور ہم واپس لمباٹے آئے ایک Factory Outlet سے کشمیرا(Cashmera) کی نہایت نایاب شال، مفلر اور سکارف خرید کر ہوٹل پہنچے۔ قازقستان، کرگستان اور اُزبکستان کی آئندہ دنوں کی منصوبہ بندی اور سفر کے فیز ٹو پر کام شروع کیا۔

آج جمعہ ہے اور میری خواہش ہے کہ نمازِ جمعہ مسجد میں ادا کروں۔ ابھی دیکھتے ہیں جو اللہ کو منظور ہوا۔ آج Nick جو نفیسہ کی باس کا خاوند تھا اور اُس نے بھائی کے کہنے پر فیملی ٹرسٹ کی رقم Invest کی ہے اور معاملہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ نفیسہ سے Request کی تھی کہ پلیز میرے لیے اس Investment کی حقیقت ریسرچ کر کے پتہ کر دو تو مہربانی ہو گی۔ آج نماز جمعہ، شاپنگ، نفیسہ کی ریسرچ اور کھانے کے علاوہ صبح کی فلائٹ کے لیے تیار ہونا ہی ضروری کام ہیں۔ ہم نے کار منگوائی اور نفیسہ کی ریسرچ مکمّل ہوئی اور ہم ہزارہ ریسٹورنٹ میں کھانے کے لیے گئے۔ اب صبح کے لیے ٹیکسی آرڈر کرنے کے بعد سامان کی پیکنگ شروع کر دی۔

آج 5 بجے صبح جاگ کر ہم تیار ہو کر ہوٹل کی لابی میں پہنچ گئے اور تھوڑی دیر بعد ہماری ٹیکسی ایئر پورٹ کی طرف رواں دواں تھی۔ حسبِ معمول سردی کافی تھی اور

ہم لمباٹا سے نکل رہے تھے۔ لمباٹا کی بڑی بڑی پاور ہاؤس کی چمنیاں بے شمار دھواں اُگل کر فضا کو آلودگی سے بھر رہی تھیں۔ میں نے نفیسہ کو بتایا کہ اتنی سردی میں اپنے شہریوں کے گھروں کو گرم رکھنے کے لیے فی الحال اس ملک کے پاس کوئلے سے چلنے والے پاور سٹیشن کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ ہم وقت سے پہلے ہی چنگیز خان ایئر پورٹ لمباٹا پہنچ گئے۔

ہم نے کچھ انتظار کے بعد چیک اِن کرایا اور ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ کافی اور کرانساں سے ناشتہ کرنے کے بعد اپنی فلائٹ کی بورڈنگ کال کا انتظار کرنے لگے۔ آخر ہماری فلائٹ بھی بورڈ ہوئی اور بوئنگ 737-800 جو کہ منگولین ایئر لائن کا طیارہ تھا نے ہمیں مع باقی مسافروں کے لے کر بیجنگ کی طرف رن وے سے اُڑا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں ایک بار یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا میں اپنی والدہ محترمہ مرحومہ کے آباؤاجداد کی دھرتی چھوڑ رہا ہوں۔ بے شک ایک طرف چنگیز خان جیسے تاریخ کے ظالم ترین انسان سے کسی قسم کا تعلّق بے چین کر رہا تھا تو دوسری طرف ہماری گائیڈ نساء کے یہ لفظ تھوڑا سہارا دے رہے تھے کہ چنگیز خان کو مغرب میں ضرورت سے زیادہ بلکہ مبالغہ آمیزی کی حدیں عبور کر کے ظالم بتایا جاتا ہے۔ بقول نساء وہ اچھا آدمی تھا۔ اصل نام تیمور دین تھا اور چنگیز خان کا لقب اُسے قوم نے دیا تھا جس کا مطلب اچھا، قابل اور انصاف پسند تھا۔ تاریخ میں چنگیز خان یا اُس کے پوتے ہلاکو خان اور دوسروں کے لیے یہ لقب مناسب نہیں لگتا۔ جو حقیقت ہو گی اُسے غیر جانب دارانہ تحقیق کرنی ہے۔ تلخ حقیقت کو جانب دارانہ ثابت یا غیر ثابت نہیں کرنا، ورنہ میں تحقیق کی اصل روح سے انحراف کر گزروں گا۔

ہماری فلائٹ بیجنگ ایئر پورٹ پر اُتری اور خاصے لمبے انتظار کے بعد امیگریشن سے فراغت پائی۔ یہ ایئر پورٹ نہایت وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ Open Plan بلڈنگ ہے جو بے شمار بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ پورا

ایریا کور ہے اور ہر جگہ آسانی سے نظر آتی ہے۔ ہماری چھوٹی ٹرین ہمیں ایئر پورٹ کے ایک حصے سے لے کر دوسرے حصے میں لے آئی جہاں ہم نے اپنا سامان وصول کیا۔ دوسری فلائٹ جس نے ہمیں عروچی جو سنجیانگ صوبے کا دارالحکومت لے کر جانا تھا چیک اِن کرایا۔ ہماری فلائٹ تقریباً 2 گھنٹے ایئر ٹریفک کی مصروفیت کی وجہ سے لیٹ روانہ ہوئی اور چار گھنٹے کے بعد عروچی پہنچی تو ہمیں خطرہ تھا کہ شاید ہوٹل کی گاڑی جس نے ہمیں اُٹھانا تھا انتظار کرتے کرتے واپس نہ چلی گئی ہو مگر ہمارا ڈرائیور ہاتھ میں تختی پکڑے کھڑا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد Grand Mercure ہوٹل پہنچ گئے۔ یہ اچھا فائیو سٹار ہوٹل ہے جس کا مالک مسلمان ہے۔ جب میں نے حلال کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ کھانا حلال ہے اور ریسٹورنٹ کی منیجر بھی مسلمان ہے۔ شام کا کھانا ہم نے ہوٹل میں کھایا اور پھر آرام سے سو گئے۔

آج صبح باتھ میں گرم پانی میں عرصے کے بعد لیٹنے میں بڑا سکون ملا۔ اس کے بعد ناشتہ کے لیے Buffett میں پہنچا تو ایک Unighur لڑکی نے کنفرم کیا کہ ناشتے کی مرغی اور بیف حلال ہیں۔ Unighur، چینیوں سے نہ صرف مذہباً بلکہ نسلاً بھی مختلف ہیں۔ ترکی اور ایرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور چینیوں کے مقابلے میں حسین ہیں۔ اخلاقاً بھی نسبتاً اچھے ہیں یہ مشاہدہ ہم نے کاشغر اور عروچی میں بھی کیا۔ چینی ٹیکسی ڈرائیور سوٹ کیس اُٹھانے میں اکثر مدد نہیں کرتے۔ Unighur مسلمانوں میں ہم نے اخلاق اور قدرتی حسن چینیوں سے کئی درجہ بہتر دیکھا ہے۔ آج کل یہاں کے عروچی مسلمانوں پر حکومت کے مظالم کا چرچا بھی سنا ہے جس کے متعلق مشاہدہ محدود ہے کیونکہ ہمیں زبان کی وجہ سے حالات سے آگاہی کا مسئلہ ہے۔ کوئی بھی ہمیں اس حساس مسئلے پر رائے دینے کو تیار نہیں تھا۔ آج ہم یہاں کچھ سیر کریں گے اور لیٹ لنچ کرنے کے بعد ایئر پورٹ سے چین کو خدا حافظ کہتے ہوئے ایک طرف Relief محسوس کریں گے کیونکہ ہم انٹرنیٹ کی کمی محسوس کرتے رہے ہیں دوسری طرف کاشغر اور

عروچی (Unighur) مسلمانوں سے بچھڑنے کا تھوڑا دُکھ بھی ہو گا۔ بہر کیف اللہ حافظ چین اور السّلام علیکم قازقستان۔ اِن شاء اللہ ہم رات کو الماٹے پہنچ جائیں گے۔

ہماری فلائٹ رات کو الماٹے پہنچ گئی اور ہم بآسانی امیگریشن، کسٹم اور سامان کولیکشن کے مراحل طے کر کے باہر پہنچے تو ایک پچاس ساٹھ سالہ ٹوپی پہنے ہوئے آدمی نے استقبال کرتے ہوئے ہمیں ٹیکسی کا پوچھا۔ وہ تھوڑی بہت انگلش بول سکتا تھا؛ مسلمان قازق تھا اور اس نے بتایا کہ وہ ہمیں Ambassador ہوٹل لے جا سکتا ہے اور کرایہ 4 سے 5 امریکی ڈالر ہو گا۔ ہم اس کے ساتھ چل پڑے اور اس نے سامان اُٹھا لیا۔ ایک 35 سے 40 سالہ پرانی مرسیڈیز میں ہمارا سامان رکھا اور ہم گاڑی میں بیٹھ گئے جس کی سکرین کافی گاڑیوں کی طرح کریک تھی۔ وہ نہایت دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اُس نے بتایا کہ روسیوں نے پچھلے 75 سال مسلمانوں پر ظلم کیا ہے اور وہ اچھے لوگ نہیں تھے۔ اب نورِ سلطان کی حکمرانی میں حالات کچھ بہتر ہیں۔ وہ شادی شدہ آدمی ہے اور اس کے دو بچے یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں یا پڑھتے تھے۔ وہ ہر بات پر سیٹی بجاتا تھا۔

اُس نے بتایا کہ وہ ہمیں کرگستان کے دارالحکومت بشکک بھی لے جا سکتا ہے۔ اُس کے لیے ایک سو ڈالر کم از کم خرچہ آئے گا۔ ہمارا ہوٹل آ گیا تو نور نے بتایا کہ یہ ترکوں کا ہوٹل ہے۔ وہ سامان میں ہماری مدد کر رہا تھا اور لابی میں بیٹھ کر میں نے دو دن بعد کے لیے اُس سے مفصّل بات طے کرنا چاہی مگر اُس کی ناکافی انگریزی آڑے آ رہی تھی۔ دوسری میز پر بیٹھی تین لڑکیوں میں سے ایک نے انگریزی میں ہماری مدد کی آفر کی۔ جو ہم نے بخوشی قبول کی اور معاملات طے کیے کہ اگر وہ ہمیں بشکک لے جائے گا تو پرسوں صبح 9 بجے ہوٹل پہنچ جائے اور کرایہ 100 امریکی ڈالر ہو گا۔ اگر ہم جھیل الماٹے اور راستے میں بھی سیر کریں گے تو پھر کرایہ 150 ڈالر ہو گا جو ہم نے قبول کر لیا۔

ہم صبح ہوٹل کے بوفے بریک فاسٹ سے فارغ ہوکر الماٹے کی مشہور و معروف جگہوں کو دیکھنے چل پڑے۔ راستے میں فرنچ ریسٹورنٹ جو فِش میں سپیشل تھا دیکھا اور اُن سے بات کی رات کو فِش اینڈ چپس کھانے کے لیے ٹیبل ریزرو کرلیا۔ چل پڑے تو ایک پارک میں آئے جس میں دو لڑکیوں کے مجسّمے تھے۔ سامنے گورنمنٹ کی بڑی بلڈنگ تھی؛ غالباً جب الماٹے دارالحکومت تھا تب یہ ایوانِ صدر تھا۔ اُس سے آگے ایک پارک اور گرجا گھر تھا جو رنگ برنگی عمارت پر مشتمل تھا۔ یہ پارک دونوں جنگِ عظیم میں مرنے والوں کی یادگار تھا جس میں ایک نہ بجھنے والا شعلہ روشن تھا اور وہاں پر جنگی مجسّمے بھی تھے۔ گرجا گھر کے باہر خاصی کھلی جگہ تھی جہاں پر سیکڑوں کے حساب سے کبوتر تھے جن کو لوگ دانے ڈال رہے تھے۔ ایک دو بوڑھوں نے ریڑھیاں لگا رکھی تھیں جن پر وہ کبوتر کے لیے دانے بیچ رہے تھے۔ حیرانی کبوتروں کی تعداد سے زیادہ اس بات پر تھی کہ کبوتر لوگوں کے کندھوں، سروں اور ہاتھوں پر بھی بیٹھ جاتے تھے۔ بعض بچے اُن کو پکڑ لیتے اور اپنے والدین کے پاس لے جاتے اور پھر چھوڑ دیتے۔ کبوتر انسانوں سے خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے اس لیے بالکل گُھلے ملے ہوئے تھے۔

یہاں سے ہماری منزل Grand مسجد تھی جس کی طرف ہم چل پڑے اور مسجد کے احاطے میں پہنچے تو دیکھا کہ مسجد کے صحن میں بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ نمازِ ظہر بھی ہونے والی ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہوا کہ میں سوٹ میں ملبوس تھا جس کے مکمّل پاک ہونے میں شبہ تھا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ بذریعہ ٹیکسی ہوٹل جا کر کپڑے بدل کر واپس باجماعت نماز ادا کر سکتا۔ میں نے کوشش کی کہ اگر کہیں ٹریک سوٹ خرید سکوں تو وضو خانے میں بدل کے باجماعت نماز ادا کر سکوں۔ مجھے باآسانی مسجد سے تھوڑی ہی دور ایک بوڑھی عورت سے تقریباً 7 ڈالر میں ٹریک سوٹ مل گیا۔

میں نفیسہ کو خواتین کے لیے مخصوص جگہ پر چھوڑ کو وضو خانے کی تلاش میں

گیا۔ایک مقامی شخص سے وضو خانے کا راستہ پوچھا جو مجھے ساتھ لیے لوگوں سے راستہ پوچھ کر وضو خانے چھوڑ گیا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جلدی کپڑے بدلے ؛وضو کر کے مسجد میں آ کر سنتیں ادا کیں ؛تھوڑی دیر کے بعد امام صاحب آئے اور انہوں نے وعظ شروع کیا جو میں پوری طرح سمجھ نہ سکا مگر اتنا جان گیا کہ مسجد اہلِ سنت کی ہے۔ امام صاحب نے جنازہ اورمیت کے ایصال ثواب کے لیے خیرات کے متعلّق خطبہ دیا جس میں امام مسلمؒ اور امام بخاریؒ سے حضور سرورِ کائناتﷺ کی احادیث کے حوالے بھی تھے۔ نماز کے بعد نفیسہ کو لیا تو اُس نے بتایا کہ جس کمرے وہ باقی عورتوں کے ساتھ تھی وہاں پر نماز سے پہلے امام تشریف لائے تھے۔ دُعا کی اور لوگوں نے وہاں پر نان وغیرہ لائے تھے اور سب لوگوں کے ساتھ نفیسہ نے بھی ایک نان لے لیا مگر اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے بعد والے غریب آدمی کے حصے میں بہت کم خوراک آئی جس کا وہ زیادہ مستحق تھا۔ نفیسہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ شاید اس نے غلطی کی۔ امام نے بذریعہ گوگل ٹرانسلیٹر نفیسہ کو بتایا کہ وہ ان لوگوں کے فوت شدگان کے لیے دُعا کر رہے ہیں کیونکہ یہ لوگ روسیوں کی وجہ سے قرآن نہیں پڑھ سکے۔ اس لیے وہ کھانا لاتے ہیں اور امام صاحب ختم پڑھ کر ان کے رشتہ داروں کی روحوں کے ایصالِ ثواب کے لیے دُعا کرتے ہیں۔ تقریباً یہی طریقہ ہمارے ہاں بھی ہے۔

ہم مسجد سے باہر آئے اور ایک بینچ پر ایک غریب بوڑھا نان کھا رہا تھا۔ نفیسہ نے مجھے بتایا کہ یہی وہ بوڑھا آدمی ہے جس کے بارے میں وہ مجھے بتا رہی تھی۔ میں نے کہا کہ بجائے نان دینے کے اسے دس ڈالر کا نوٹ دے دیتے ہیں:

ؔ درد دِل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

راستے میں امریکن کافی شاپ پر وائی فائی، کافی اور کیک کے لیے رُکے۔ مشہور حمام کے پاس سے گزرتے ہوئے واپس ہوٹل آئے اور شام کو فرنچ ریسٹورنٹ میں کھانے سے بہت مایوس ہوئے۔ کھانا ناکافی تھا اور انگلش فش چپس سے مختلف تھا۔

ستان ممالک

اگلے دن الماٹے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہمارا ڈرائیور بھی آن پہنچا۔ سامان گاڑی میں رکھا اور بذریعہ ایک لیڈی مترجم وضاحت کی کہ پہلے ہم جھیل الماٹے جائیں گے جو Altaei پہاڑوں پر واقع ہے جو شہر کے قریب ہے۔ ہم الماٹے کی مین روڈ پر واقع نور سلطان پارک کے قریب پہنچ گئے۔ یہ صدر صاحب کے نام پر بہت بڑا پارک بنایا گیا ہے ایک طرف شہر ہے اور دوسری طرف پہاڑی سلسلہ۔ یہ پارک دونوں کے درمیان واقع ہے۔ نہایت خوبصورت پارک ہے اور سڑک کے دوسری طرف نہایت عالی شان مکانات بنے ہوئے ہیں۔ یہ نہایت خوبصورت اور مہنگا علاقہ ہے۔ ہماری گاڑی پہاڑ کے دامن کے قریب پہنچ رہی تھی اور پارک کا اختتام ہوا تو بڑے بڑے ریسٹورنٹوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو پہاڑ کے دامن پہ ختم ہوا۔ ہمارا ڈرائیور چیک پوائنٹ پر گاڑی کھڑی کر کے گیا اور چند باتیں گارڈ سے کر کے واپس آ گیا۔ وہ بات بات پر ہاتھ کے اشارہ اور منہ سے سیٹی بجاتے ہوئے غالباً بتا رہا تھا کہ اس نے بغیر کوئی خرچہ کیے الماٹے لیک پر جانے کی اجازت لے لی ہے۔ اب گاڑی پہاڑ پر چڑھ رہی تھی اور ہم پہاڑ Altaei کی خوبصورتی سے لطف لے رہے تھے۔ آہستہ آہستہ سڑک پر برف گرنا شروع ہو گئی جو زیادہ ہو رہی تھی۔ گاہے بگاہے برف منجمد بھی ہو رہی تھی جو

نہایت خطرناک ہوتی ہے۔

ہم نے A کلاس سے S کلاس تک مرسڈیز گاڑیاں رکھی ہیں۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ S کلاس کو دنیا کی بہترین کار بجا طور پر کہا جاتا ہے مگر برف میں اس گاڑی کو چلانا نہایت خطرناک ہے۔ چنانچہ یہ E کلاس جو غالباً 35 سے 40 سالہ پرانا ماڈل تھی اور ہمارا ڈرائیور بھی ضرورت سے زیادہ ہی خطرہ لینے والا شخص معلوم ہوتا تھا۔ جوں جوں ہم اوپر جا رہے تھے توں توں ہماری تشویش بڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک قازقستانی آدمی سڑک کے سامنے آیا اور اشارہ کیا کہ آگے بہت پھسلن ہے مگر ہماری گاڑی برف میں پہاڑ کی اُونچائی پر جا رہی تھی ہم نے تھوڑی دور آگے جانے کا ارادہ کیا۔ ابھی چڑھائی اور چند موڑوں کے بعد سڑک اور خطرناک ہو رہی تھی کہ ہماری گاڑی کو ایک گاڑی نے اوورٹیک کیا اور رُکنے کا اشارہ کیا وہ گاڑی تو رُک گئی مگر ہمارے ڈرائیور نے گاڑی نہ روکی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک منی وین نے ہماری گاڑی کو اوورٹیک کیا اور پھر گاڑی روکی میں نے بھی ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کہا اب ہم پہاڑ کی خاصی بلندی پر تھے۔ سامنے ایک پُل تھا جس کو عبور کر کے سڑک اوپر جا رہی تھی جو ہمیں نظر آ رہی تھی۔

ہم نے اب فیصلہ کیا کہ ایسی خطرناک سڑک پر جھیل کے نظارے کے لیے خطرہ مول لینا عقل مندی نہیں اب واپس الماٹے چلتے ہیں۔ ڈرائیور آگے جانے کا کہہ رہا تھا ہم نے بتایا نہیں جانا۔ منی وین والے نے کہا کہ ہم اُس کی گاڑی میں جا سکتے ہیں جو مرسڈیز کے مقابلے میں ان حالات کے لیے مقابلتاً بہتر تھی مگر پھر بھی انتہائی خطرناک سفر کی وجہ سے ہم واپس الماٹے آئے اور بشکک کی طرف گاڑی چل پڑی۔ نہایت ہی خوبصورت صبح تھی، سورج نکلا ہوا تھا اور ہماری گاڑی الماٹے اور بشکک کی مین روڈ پر رواں دواں تھی۔ ہمارے بائیں طرف Altaei پہاڑی سلسلہ ہے اور ہمارے دائیں طرف Steppe کا تاحدِ نگاہ نظر آنے والا میدان۔ زمین گاہے بگاہے

زرعی پیداوار کے لیے بھی استعمال میں آئی ہے مگر آبادی نہایت کم ہونے کی وجہ سے کئی کئی میلوں تک کوئی مکان نظر نہیں آتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو بہت بڑے رقبے سے نوازا ہے مگر زیادہ تر زمین زیرِ کاشت نہیں۔ صرف بھیڑیں، گائے اور گھوڑے چر رہے ہیں۔ جہاں زیر کاشت خطہ اراضی ہے وہ لمبائی میں تاحدِ نگاہ ایک ہی قطعہ ارض نظر آتا ہے۔

ہمارا ڈرائیور روڈ ورکس اور سائن نہ ہونے کی وجہ سے 24 کلومیٹر آگے آگیا ہے اور اب واپس مڑ کر دنیا کی ناف کی طرف جانا ہے۔ اُس کے بعد الماٹے بشکک روڈ ہے ہم نے Unigiratas جانا ہے۔ شوزی بیٹے میرے پچاس سال سے زیادہ پرانے دوست بلکہ بڑے بھائی سید فضل عباس جعفری کے صاحبزادے ہیں۔ قازقستان میں برطانوی سفیر کے اسسٹنٹ رہ چکے ہیں اور وہ کتاب جو برطانوی سفیر نے لکھی تھی؛ اُس میں بھی شوزی بیٹے نے مدد کی تھی۔

یہ خاص مقام اس کتاب میں درج ہے۔ یہ جگہ ایک عورت بی فاطمہ دولتوا نے ڈھونڈی 1999ء میں۔ بقول مقامی لوگوں کے یہ جگہ دنیا کی ناف ہے۔ یہاں پہ کھڑا پتھر اور Dragon wing کی ایک غار ہے۔ ایک اور جگہ ہے جہاں پہ کھڑے ہونے سے سکون ملتا ہے۔ دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ یہاں Cosmic انرجی آتی ہے۔ منفی خیالات دور ہوتے ہیں۔ کینسر کی سٹیج پہلی اور دوسری کا علاج بھی ہوتا ہے وغیرہ۔ مائی بی فاطمہ آپ کو دُعا دیں تو دولت میں اضافہ اور مشکلات حل ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ راستے پر تھی اس لیے جانے کا پروگرام بنایا اور پہنچ گئے۔

غار پر کھڑے پتھر کو موجود پایا اور پوچھا کہ آیا بی فاطمہ مسجد تعمیر کرا رہی ہیں؟ ہم حصّہ ڈالنا چاہتے ہیں تو پتہ چلا مقامی لوگوں سے کہ یہاں بھی پاکستان کی طرح تقریباً ہر زیارت اور خانقاہ کے ساتھ ملنگ لوگوں یا صاحبِ مزار کے موجودہ وارثین نے اپنے کارندے چھوڑے ہوتے ہیں جو لوگوں کو مختلف طریقوں سے اس بات پر

قائل کرتے ہیں کہ صاحبِ مزار کے وارثوں کو ہی نذر نیاز دینے سے مرادیں پوری ہوتی ہیں۔اس لیے نذر نیاز دیں کہ مرادیں بھر آئیں اور اگر مرادیں پوری ہو چکی ہیں تو اب ادائیگی ان ہی وارثین کا حق ہے۔ بہر حال ہم جاننے کے بعد واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک مقامی آدمی نے بتایا بذریعہ گوگل ٹرانسلیٹ کہ مسجد وغیرہ کا سب جھوٹ ہے تو ہم اپنی اگلی منزل کو چل پڑے۔

بارڈر پر پہنچے تو گاڑیوں کی لمبی قطاریں تھی۔نور نے بتایا کہ اُسے اس قطار میں لگنا ہے اور دوسری طرف پہنچنے میں دو گھنٹے لگ سکتے ہیں یا ہم پیدل تین سو گز بارڈر مع سامان کراس کر لیں۔ دوسری طرف ٹیکسی لیں جو 5 ڈالر میں ہمیں ہمارے ہوٹل پہنچائے گی۔ ہم نے اسے وہیں فارغ کر دیا پیدل امیگریشن کرا کے بارڈر کراس کیا۔ ایک دریا بارڈر کا کام کرتا ہے اور دوسری طرف امیگریشن والے نے نام پڑھا اور کہا ذوالفقار مسلمان ہو تو میں نے کہا الحمدللہ۔ اس نے پاسپورٹ سٹیمپ کیا اور ہم کرگستان آ گئے۔

آخر ہم نے پانچ ڈالر میں سودا کیا اور ایک 7 سیٹر کار میں بیٹھ گئے تو پتہ چلا کہ ڈرائیور اور سواریاں ڈھونڈ رہا ہے تا کہ 10 ڈالر کا پھیرا لگا سکے۔ہم نے اُسے چلنے کو کہا کہ ابھی چلو ہم نے ٹیکسی شیئر نہیں کرنی اور تمہیں دس ڈالر دے دیں گے۔ کرگستان نہایت غریب ملک ہے اور بشکک دارالحکومت ہونے کے باوجود ایک چھوٹے سے شہر سے بڑا نہیں۔ اب ہوٹل پہنچ گئے اور ریسیپشن سے معلومات لی کہ تاشقند جانے کے کون کون سے طریقے ہیں ؟ اُس نے بتایا کہ بائی ایئر جا سکتے ہیں جس میں ہمیں سیر نہ کرنے کا دُکھ تھا۔ بذریعہ کار بھی جا سکتے ہیں جو بہت مہنگا ہو گا۔ بقول ریسپشنسٹ کے بس بہترین حل ہے جو رات کو چلتی ہے اور تقریباً بارہ، چودہ گھنٹے کے سفر کے بعد تاشقند پہنچا دیتی ہے۔ بسیں نئی اور اچھی ہیں اور ہمیں ٹکٹ لینے بس سٹیشن ویسٹ کل جانا پڑے گا اور شام کو بس میں سفر کر سکتے ہیں۔

Navat جو مشہور ریسٹورنٹ چین ہے۔ وہیں پر نہایت مزیدار کھانے جس میں ہرن کا گوشت بھی شامل ہے کھایا اور ساتھ ہی ریسرچ مکمّل کی۔ اب ہم نے پروگرام کو نئے سرے سے ترتیب دیا کہ کل بشکک کا ٹور مکمّل کر کے Shymkent جو قازقستان میں ہے جائیں گے۔ وہاں سے ترکستان جہاں بادشاہ تیمور نے ایک بڑے ولی احمد یوساویؒ کا مزار بنوایا ہے۔وہاں فاتحہ پڑھنے کے بعد تاشقند جائیں گے۔

؎ مقدور ہوتو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم

تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ناشتے کے بعد ہم ٹیکسی پر شہر کے مشہور و معروف اوش بازار پہنچ گئے۔ وہاں پر جا کر اس ملک کی غربت کا اور بھی احساس ہوا۔ہم نے بازار کا چکر لگایا جہاں ہر قسم کے سٹال تھے سبزیاں، فروٹ، گوشت اور ہر قسم کے کپڑے بوٹ وغیرہ۔ہم نے خشک میوے اور کھجور خریدنے پر اکتفا کیا اور ٹیکسی پکڑ کر محمود کاشغریؒ مسجد آئے۔ نہایت وسیع و عریض خوبصورت مسجد ایک ترک النسل سکالر کی یاد میں بنائی گئی ہے۔اس کے بعد ری پبلکن مسجد میں گئے جو نہایت خوبصورت استنبول کی مساجد کی طرز پر بنائی گئی نئی مسجد ہے۔ چونکہ نماز کا وقت نہیں تھا ہم مین سکوئر آگئے اور وہاں پر مجسّمات دیکھے۔ نہ بجھنے والا شعلہ جو شہیدوں کی یاد میں جل رہا تھا دیکھا اور ایک بار پھر Navat میں پہنچے اور لنچ کرنے کے بعد ہوٹل پہنچے تو تھوڑی ہی دیر میں ہمارا ڈرائیور جس نے ہمیں Shymkent لے جانا ہے پہنچ گیا۔ ٹوپی پہنے ایک 40،45 سالہ نوراللہ نامی آدمی تھا۔

ہم نے ایک بار پھر کرگستان اور قازقستان کی امیگریشن اور کسٹم کرانا تھی۔ مسافروں کی قطاریں لمبی تھیں اس لیے ہمارے ڈرائیور نے مختلف سمت کا رُخ اختیار کیا۔ مجھے ٹوٹی پھوٹی انگلش اور اُردو میں بتایا کہ 20،25 کلومیٹر دوسری طرف کا چکر لگا رہا ہے۔ جس سے حقیقت میں ہمیں وقت کی بچت ہوگی۔ جب ہم اس بارڈر پر پہنچے تو

واقعی ہجوم زیادہ نہیں تھا۔ ہم ایک گھنٹے میں امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہو گئے تھے اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

ہم تقریباً ایک سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور 300 کلومیٹر کا سفر باقی تھا۔ تھوڑی تھوڑی برف شروع ہو گئی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ ہمیں تشویش ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے برف رُک گئی۔ سڑک پر منی وین نے تیزی سے سفر شروع کر دیا۔ ابھی پچاس ساٹھ کلومیٹر ہی گئے تھے کہ پھر برف باری شروع ہو گئی۔ اس بار بہت زور سے برف باری ہو رہی تھی سفر دشوار ہو رہا تھا۔ اسی طرح دو تین بار ہوا۔ ہمیں ایسے پتہ چلا کہ سفر جاری رکھنا ناممکن ہو جائے گا لیکن آخر کار ہم اپنی منزل پر ڈرائیور سے باتیں کرتے کرتے جا پہنچے۔ اُس نے بتایا کہ وہ پاکستان، انڈیا اور بنگلہ دیش رہ چکا ہے۔ وہ مولوی طارق جمیل اور رائے ونڈ والوں کا معترف ہے۔ عربوں کو پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ وہابی ہیں۔ نظام الدین اولیاؒ کے مزار سے منسلک مفتی سعد کا بھی معترف ہے۔ صرف حضورﷺ اور صحابہ کو مانتا ہے۔ میں نے زبان کے مسئلے کی وجہ سے بحث مناسب نہ سمجھی۔ اُس نے اپنے ایک جاننے والے پاکستانی تاجر قاسم بھائی جو کراچی کے ہیں سے فون پر بات بھی کرائی۔ وہ گاڑیوں کے پرزوں کا کاروبار کرتا ہے۔ نور اللہ نے بتایا کہ قاسم صاحب کے سات بچے ہیں۔ ایک بیوی پاکستانی کراچی میں ہے اور دوسری بیوی کرگستانی ہے جو یہاں بشکک میں اُن کے ساتھ رہتی ہے۔ قاسم صاحب کی لمبی داڑھی ہے۔ ہم بارہ بجے کے بعد اپنے ہوٹل پہنچے۔

ہوٹل کی خاتون کو انگلش نہیں آتی تھی۔ میں نے کوشش کر کے ریسپشنسٹ کو بتایا کہ مجھے ترکستان حضرت احمد یوساویؒ کے مزار پر جانا ہے اور وہاں فاتحہ پڑھنے کے دس منٹ بعد واپس بھی آنا ہے اس لیے ٹیکسی کا بندوبست کرے۔ اس نے فون ملایا اور چند باتیں کرنے کے بعد غصّے میں فون رکھ دیا میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ٹیکسی ڈرائیور 40ہزار قازقستانی مانگ رہا ہے جو بہت زیادہ ہے اس لیے اُس نے

غصّے میں فون بند کیا ہے اور ابھی اور لوگوں کو ٹرائی کرے گی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھے فون دیا کہ میں اس ٹیکسی ڈرائیور سے بات کروں کیونکہ وہ انگریزی بول سکتا تھا۔ بہرحال ہمارا سودا 25 ہزار قازقستانی پر طے ہو گیا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ وہ بیس منٹ تک ہوٹل آجائے گا، وہ حسبِ وعدہ پہنچ گیا۔ ہمارا سفر شروع ہوا؛ اس نے اپنا نام اصغر بتایا اور مجھے پوچھا کہ تم نے وہاں مزار پر نماز پڑھنی ہے تو میں نے بتایا کہ میں نے فاتحہ پڑھنی ہے۔ نماز کا وقت ویسے بھی نہیں ہوگا جب ہم وہاں ہوں گے۔ یاد رہے کہ خواجہ احمد یساوی ایک ترک نسل سکالر تھے جن کا یہ مزار بادشاہ تیمور نے بنوایا تھا۔ ازبکستان، قازقستان اور Ugihur قبائل ہیں ان کی ہستی کو نہایت عزت و احترام و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ احمد یساویؒ نے 63 سال کی عمر میں دنیا سے کنارہ کشی کر لی تھی یہ کہتے ہوئے کہ وہ حضورﷺ کی 63 سالہ دنیاوی زندگی سے زیادہ دنیاوی زندگی گزارنا نہیں چاہتے۔ اس لیے خانہ خاموشی میں چلے گئے اور ''دیوانِ حکمت'' تصنیف کی۔ وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی تھے اور صوفی ولی اللہ تھے اور خواجہ یوسف ہمدانیؒ کے مرید تھے۔ فقہ اور حدیث کے ماہر بھی تھے۔ سات سال کی عمر میں یتیم ہوئے تھے۔ ارسان بابا نے اُن کی پرورش کی۔ چونکہ اُن کے والدِ مرحوم ابراہیم بھی ایک مانے ہوئے ولی اللہ گزرے تھے۔ جن سے خاصی کرامات وابستہ تھیں۔ اپنی بڑی ہمشیرہ کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ اُن کی ہر بات مانتے تھے۔ تعلیم کے لیے بخارا گئے اور خواجہ یوسف ہمدانیؒ کے شاگرد رہے۔ حسن اندا کانیؒ کی وفات کے بعد خواجہ یوسف صمدانیؒ کی نقشبندی خانقاہ کے سجادہ نشین ہوئے اور اپنے مرشد کے حکم پر سجادگی چھوڑ کر ترکستان شہر میں دینِ اسلام کی تبلیغ کے لیے گئے۔ وہیں اُن کا یہ مزار ہے۔ یہ خواجگان میں سے ایک ہیں۔ ایک اور چھوٹا مزار باہر ہے جو ربیعہ سلطان بیگم کا ہے جو اُولگ بیگ جو تیمور کا پوتا تھا کی بیٹی تھی۔ یہ مزار اُس کے خاوند نے جو ازبک علاقہ کا بادشاہ تھا نے بنایا تھا۔ اس مزار کے اندر اور بھی شاہی خاندان کی قبور ہیں۔

ترکستان سے Shymkent واپسی پر تیمور لین کے قصبے سے گزرے جو امیر تیمور کے نام پر موجود ہے۔ راستے میں ہائی وے کے کنارے ایک اُونچی چوٹی بھی نظر آئی ہے جو کہ اس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ جب مغل حملہ آور ہوتے تو ترکستان کے محافظ اس چوٹی پر آگ جلاتے جو اہلِ ترکستان کو کئی میل دور سے نظر آجاتی اور وہ حملہ پسپا کرنے کے لیے بندوبست کر لیتے۔

ڈرائیور اصغر جو ایک پڑھا لکھا 35 سالہ جوان تھا جس کی بیوی روسی عیسائی تھی۔ دونوں کی دوستی شادی میں بدل گئی۔29 سالہ بیوی سے اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اصغر کی ماں بھی عیسائی ہے۔ باپ مسلمان تو ہے مگر شرابی ہے اورالکحولِک ہو چکا ہے۔ اصغر کی فیملی کی خاصی زمینیں جو پہاڑوں میں ہیں اور ان پر اس کے خاندان سے تنازعہ چل رہا ہے۔ اصغر ٹورازم کا کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ وہ Oil Rig بنانے والے کارخانے میں Aqlobi کے علاقے میں سپر وائزر رہ چکا ہے۔ بہت سے انگلش، آئرش اور امریکن کے ساتھ کام کر چکا ہے۔ بقول اصغر اُس نے وہ کام اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ ایک تو اس علاقے کی آب و ہوا صاف نہیں ہے۔ دوسری بڑی وجہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر شکاری ہے اور اپنی شکار کرنے کی آزادی اور سکون کو نہیں کھو سکتا۔ دفتروں میں کام کرنا اُس کے بس کی بات نہیں۔

واپسی کا سفر پانچ گھنٹے تھا جو بہر حال ختم ہوا۔ہم نے نفیسہ کو ہوٹل سے مع سامان اُٹھایا اور ایک اُزبک ریسٹورنٹ کھانے کے لیے آئے۔ہم نے کھانا آرڈر کیا جو نیلوفر اور اذن نامی لڑکیوں نے سرو کیا۔کھانے کے بعد ہمیں ڈرائیور بال کٹوانے کا کہہ کر گیا تھا۔ ابھی جانے کا وقت ہو گیا تھا مگر وہ نہیں آیا تھا تو ہم نے فون کر کے بلایا؛ ہمیں مع سامان تاشقند کی بس کے پاس چھوڑ کر خدا حافظ کر کے کرایہ وصول کر چلا گیا۔

آج ہم نے اپنے ٹور کا پہلا سفر بذریعہ بس کرنا تھا جس کی پہلی وجہ مقامی لوگوں کے ساتھ مقامی بس کے سفر کا تجربہ حاصل کرنا تھا۔دوسری وجہ یہ تھی کہ ہماری معلومات کے

مطابق بس کے مسافروں کو ترجیحی بنیادوں پر امیگریشن اور کسٹم سے گزارہ جاتا ہے جو گھنٹہ در گھنٹہ دونوں بارڈروں پر بیٹھنے سے بہتر تھا۔

آج ہم دوسری بار قازقستان چھوڑ آئے تھے اور اُزبکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ پہلا مرحلہ تو خوش اسلوبی سے طے ہوا۔ اُزبک امیگریشن آفیسر کو ہمارے پاسپورٹ چیک کرنے میں مشکل آرہی تھی۔ کوشش کے بعد میری کلیرنس تو ہو گئی مگر نفیسہ کو اُنہوں نے روک رکھا تھا۔ ہم اُزبک یا روسی زبان نہیں جانتے تھے اور امیگریشن والے انگلش نہیں سمجھتے تھے۔ آخر کوشش کے بعد نفیسہ والے امیگریشن آفیسر سے دوسرے دو آفیسروں (جنہوں نے مجھے امیگریشن کیا تھا) سے رائے کے لیے آیا تو میں نے واپس جا کر اُن کو بتایا کہ وہ میری بیٹی ہے اور میرا پاسپورٹ نیا ہونے کی وجہ سے اس کے پاسپورٹ سے مختلف ہے۔ انہیں بتایا کہ نفیسہ کے نام کے ساتھ میرا نام باپ ہونے کی وجہ اور دلیل ہے میں نے پاسپورٹ بننے کی تاریخوں میں چند سالوں کا فرق دکھایا کہ نئے پاسپورٹ پرانوں سے مختلف ہیں تو دونوں آفیسر نے مہر لگائی۔ ہم سامان لے کر اپنی بس کے پاس آئے اور سامان رکھا ہی تھا کہ جس آفیسر نے نفیسہ کا پاسپورٹ پہلی دفعہ دیکھا تھا؛ ہمارے پاس آیا اور پاسپورٹ لے کر چلا گیا۔ اس وقت ایک نوجوان اُزبک آفیسر ہمارے ساتھ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں گپ شپ لگا رہا تھا اُس نے اپنے ساتھی کے حوالے سے صفائی مانگی۔ کہنے لگا ابھی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہم انتظار در انتظار کرتے گئے آفیسر واپس نہ آیا۔ اب سب لوگ مع سامان بس میں موجود تھے صرف ہمارے آنے کا انتظار تھا۔

میں نے اُزبک آفیسر کو کہا کہ اگر تمہارا ساتھی پانچ، دس منٹ میں واپس نہ آیا تو ہمیں اُس سے جا کر بات کرنی پڑے گی۔ پوری بس کے مسافر ہماری وجہ سے پریشانی کا شکار تھے۔ مجھے اس بات کا سخت احساس تھا جو میں نفیسہ کو بتا رہا تھا کہ مغرب اور خاص کر برطانیہ میں ہم جس دلیری سے بات کر سکتے ہیں وہ ان کیمونسٹ ملکوں میں

نہیں کر سکتے۔ اس لیے تھوڑا صبر کر لیتے ہیں:

ع تیری محفل میں تو ہر بات پہ پابندی ہے

آخر ہم نے نوجوان اُزبک آفیسر کو ساتھ لیا اور امیگریشن کے بڑے دفتر میں گئے۔ میں نے اُزبک آفیسر کو کہا کہ اپنے ساتھی کو بلائے تاکہ میں اس کی غلط فہمی دور کر سکوں۔ بہر حال چند منٹ کے انتظار کے بعد وہ آفیسر آیا اور معافی مانگتے ہوئے ہمیں پاسپورٹ واپس کیا۔ ہم بس میں سوار ہو کر تاشقند بس اڈے پر اُترے اور ایک ٹیکسی سے 50 ہزار مقامی کرنسی سوم میں سودا ہوا اور ہم ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔

ٹیکسی والے نے دو تین بار میرے کہنے کے باوجود کسی ATM پر ٹیکسی نہ روکی۔ ہمارے پاس صرف 35 ہزار سوم اور تین ڈالر کے چھوٹے نوٹ تھے۔ ہمارا یہی خیال تھا اسے مقامی کرنسی میں کرایہ ادا کر دیں۔ ڈرائیور نے نبی پاک ﷺ کی خوبصورت نعت لگا رکھی تھی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہے تھے۔ اس نے ہماری ایک نہ مانی اور ہمیں ہوٹل پہنچا دیا۔ لابی میں ATM تھی مگر وہ کام نہیں کر رہی تھی۔ میں نے اُس کو 30 ہزار سوم اور 5 ڈالر دیے اور اپنے کمرے میں آ گئے۔

The Leader ہوٹل نیا بنا ہوا تھا، ہم آرام سے سو گئے اور صبح کا ناشتہ کیا۔ جب سے ہم اپنے گھر Fieldview سے چلے تھے سب سے مزیدار اور صاف ستھرا ناشتہ یہاں نصیب ہوا۔ بوفے میں بے شمار اشیاء گوشت، سبزیاں، چاول، ہر قسم کے خشک میوہ جات، کیک، چکن پیٹز، شہد، چائے، کافی، مالٹے کے جوس، Cereal اور مختلف قسم کی احمد کی چائے تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد کھڑکی سے باہر دیکھا تو حیرانی کی انتہا نہ رہی کیونکہ پیش گوئی کے برعکس برف باری شروع تھی۔ ان حالات میں باہر گھومنے کا فی الحال سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے فون پر اپنے ای میل اور واٹس ایپ وغیرہ کو اَپ ڈیٹ کیا ہے۔ بعد از دوپہر تیمور خان کے میوزیم اور ایک اور

جگہ جانا ہے۔کل پورا دن تاشقند کی سیر کرنے کے بعد رات کی ٹرین سے سمرقند روانہ ہوں گے اِن شاء اللہ۔

آج تاشقند میں ہماری دوسری صبح ہے۔کل کی طرح آج بھی تازہ تیار شدہ ناشتہ کیا۔سب سے پہلے ہم ہست امام گئے۔وہاں پر مسجد، مدرسوں کا کمپلیکس دیکھا۔ کچھ نوادرات خریدے۔ خاص کر دور سے آئے طالب علموں کی رہائش گاہ وغیرہ کا بندوبست اُس دور کے لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ ہم سیر کرتے ہوئے تیمور میوزیم کی طرف پاپیادہ آئے۔راستے میں ایک ریڑھی والے سے نہایت ہی لذیذ سموسہ کے سائز کی گرم چیز خرید کر کھائی جو کافی مزیدار تھی۔ایک اچھے کافی ہاؤس میں کافی اور پیسٹری کے لیے رُکے۔Wi fi کی عدم موجودگی نے کافی کا مزا بھی کم کر دیا۔نفیسہ کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی نے انگریزی میں گفتگو کی۔وہ بہت خوش اخلاق نظر آرہی تھی۔ملحقہ میز پر بیٹھی اپنی چاروں سہیلیوں کو اَپ ڈیٹ کر رہی تھی۔ وہ سب لوگ ہمیں تجسّس سے دیکھ رہے تھے۔

اُزبکستان میں ایک چیز محسوس کی جو یہ تھی کہ جوں ہی نوجوان لڑکے لڑکیوں کو پتہ چلتا کہ ہم برٹش ہیں تو وہ اپنی انگریزی بہتر کرنے کے لیے بڑے شوق و تجسّس سے گفتگو کرتے۔اس میں نہ صرف اُن کی انگریزی بہتر کرنے کی منشا پوری ہوتی بلکہ وہ ہمارے لیے مفت کے بہترین ٹورسٹ گائیڈ بھی ثابت ہوئے۔ بہرحال کافی ختم ہونے پر ہم خدا حافظ کہہ کر الوداع ہوئے۔ ایک مقام پر ایک خوبصورت نہر کو دیکھ محظوظ ہوئے۔اس کے بعد ہم پارلیمنٹ ہاؤس اور غالبًا ایوانِ صدر کے پاس سے گزرے۔ وہاں پر کھڑے باوردی گارڈ نے فوٹو گرافی سے منع کیا تو آگے چل پڑے۔ ہم تیمور میوزیم پہنچ گئے۔ٹکٹ خریدنے کے بعد اندر آئے اور یہ دیکھ کر انتہائی دُکھ ہوا کہ اس قوم کے تقریباً 80، 90 فیصد قومی نوادرات روس، جرمنی، امریکہ، برطانیہ وغیرہ دوسرے ممالک کے قبضے میں ہیں:

ے مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

یہاں پر اُن کا عکس بنا کر رکھا گیا تھا۔ اس طرح حضرت عثمانؓ سے منسوب قرآن پاک کے کچھ اوراق کی نقل بھی موجود تھی۔ تیمور خان (دور 1370) کے بعد جو سکے موجود تھے اُن کے ساتھ تیمور خان کا نام Ulus Chemistry بھی درج تھا۔ اس کا مطلب ہوا کہ تیمور خان بھی مغل چغتوں کی نسل سے تھا۔ اس کے تیسرے بیٹے کی نسل سے ظہیرالدین بابر نے فرغانہ سے دہلی پہنچ کر مغلیہ خاندان کی بادشاہت قائم کی۔ مغلوں نے اپنا تعلق چنگیز خان کے ساتھ ملانا سیاسی مصلحت کے خلاف سمجھتے ہوئے شاید ظاہر نہ کیا ہو۔ بہرحال ہم پر اب بات عیاں ہو چکی تھی کہ چنگیز کے دوسرے بیٹے کو چغتے کا خطاب تھا جس کی حکومت تاشقند، سمرقند، افغانستان اور ہندوستان کے کچھ حصوں پر تھی۔ جب بادشاہت کا وارث نہ رہا تو تیمور نے 1370 میں اپنی حکومت قائم کی۔ وہ بھی اس میوزیم کے مطابق چغتہ تھا۔ پھر اُس کی نسل سے ہی بابر نے ہندوستان میں بادشاہت قائم کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ بے شک بابر کا چنگیز خان سے تعلق ماں کی طرف سے تاریخی طور پر بتایا جاتا رہا ہے اگر تیمور خان مغل چغتے تھا تو بابر اُس کی اولاد سے ہونے کے ناطے بھی مغل چغتے تھے۔ وہ ہندوستان کے مغل چغتے کی نسل سے تھے جو چنگیز کا بیٹا تھا۔ یہ ساری معلومات میوزیم میں موجود شجرے پر درج ہے۔

تیمور خان کو مغربی اور برطانوی تاریخ دان نہایت ظالم حکمران کا درجہ دیتے ہیں اور بعض تو تیمور کو چنگیز سے بھی زیادہ ظالم ہلاکو خان سے بھی زیادہ سنگ دل کہتے ہیں۔ بہرحال میوزیم میں جو شاہی فرمان درج ہیں۔ ان سے تو تیمور خان ایک ماڈرن اور انصاف پسند حکمران ثابت ہوتا ہے۔ وہ مساوات پر یقین رکھتا تھا اور ذات یا نسل کی وجہ سے نہیں بلکہ اہلیت پر لوگوں کو ترقی دیتا تھا۔ سادات کا بہت ہی احترام کرتا تھا اور صوفیا، اولیاء اللہ کا معتقد تھا۔ اُس نے احمد یساویؒ کا مقبرہ بھی ترکستان میں بنوایا تھا۔ اور

بھی بہت سی اسلامی عمارات کا بانی تھا۔

وہاں سے فارغ ہو کر ہم بذریعہ ٹیکسی چورس بازار جانے سے پہلے ری پبلکن سکوائر گئے اور تیمور کے مجسّمے کے فوٹو لیے۔ چورس بازار سے ایک خاتون سے میں نے نماز کے لیے موزے خریدے۔ یاد رہے کہ یہاں پر منہ مانگی قیمت نہیں دینی چاہیے تقریباً آدھی قیمت سے سودا بن جاتا ہے۔ چورس بازار میں ہر قسم کے فروٹ، سبزیاں، ڈرائی فروٹ، جوتے، کپڑے اور قالین وغیرہ تھے۔ ہم نے وہاں سے میٹرو پکڑی؛ ہوٹل سے کافی فاصلے پر سٹیشن تھا؛ وہاں اُتر گئے اور ایک اٹالین ریسٹورنٹ میں نہایت ہی مہنگا مچھلی، سبزیوں اور چپس پر مشتمل کھانا کھایا۔ ریسٹورنٹ ٹیکسی کا بندوبست کیا اور ہوٹل پہنچے۔ دوسری ٹیکسی کا ہوٹل والوں نے بندو بست کیا۔ ہم سوٹ کیس گاڑی میں رکھ کر سمر قند کی ٹرین پکڑنے ریلوے سٹیشن چل پڑے۔ سٹیشن پر قلیوں کی بھیڑ میں اپنا سوٹ کیس رول کرتے ہوئے پاسپورٹ اور ٹکٹ چیک کرایا۔ سامان کو مشین سے x-ray چیک کروایا۔ ایک اور اُزبک باوردی لڑکی نے اشارہ کیا کہ اب Kiosk میں ایک اور باوردی خاتون کے پاس جائیں۔ اُس نے ہمارے پاسپورٹ اور ٹکٹ دیکھے تو بولی Russian آتی ہے؟ ہم نے کہا نہیں تو دونوں لڑکیوں نے مل کر ہمیں سمجھایا کہ سمر قند والی جس ٹرین کا ٹکٹ ہمارے پاس ہے وہ دوسرے سٹیشن سے جاتی ہے اس لیے ہم غلط جگہ پر ہیں۔ سینئر خاتون نے سامان چیک کرنے والوں کو بھی جھاڑ پلائی کہ ہمیں کیوں خواہ مخواہ سکیورٹی چیک سے تکلیف دی جبکہ یہ ہمارا سٹیشن نہیں تھا۔ اس نے ہمیں نہایت ہمدردی سے بتایا کہ باہر سے ٹیکسی پکڑیں کرایہ پانچ چھ ہزار سوم سے زیادہ نہ دیں۔ ابھی وقت ہے۔

ہم باہر آئے اور ٹیکسی والوں سے کرایے کا پوچھا تو وہ پچاس ہزار سوم مانگ رہا تھا اور آخری چالیس ہزار۔ ہم نے ایک دو اور گاڑیوں سے پوچھا تو اُنہوں نے انکار کیا۔ یاد رہے کہ یہاں پر اکثر کاروں کے مالک آپ کو بطور ٹیکسی ایک جگہ سے

دوسری جگہ لے جانے کے لیے آفر کرتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر اوقات انہیں آپ کی منزل کا پتہ بھی نہیں ہوتا۔ بذریعہ فون معلومات لے کر کبھی کبھی غلط جگہ بھی اُتار دیتے ہیں۔ چونکہ وقت کم تھا ایک بڑی گاڑی آ کر رُکی تو میں نے اُسے پوچھا کیا وہ ہمیں دوسرے ریلوے سٹیشن پر لے جائے گا؟ اس نے کہا ہاں تو میں نے کرایہ کا فیصلہ کرنے کی بجائے سامان گاڑی میں رکھوایا اور کہا جلدی چلو اور کافی دیر بعد ہم سٹیشن پہنچ گئے۔ پچاس ہزار سوم ہی دے کر ٹیکسی ڈرائیور سے جان چھڑائی اور سٹیشن کی طرف گئے۔

ایک کاؤنٹر پر ہم نے پاسپورٹ اور ٹکٹ چیک کروایا ٹکٹ پر مہر لگوائی تو سٹیشن کے دوسرے سرے پر جا کر سامان چیک کروایا اور سٹیشن کے اندر آئے۔ ہر چیز Russian میں تحریر تھی اور ٹرین کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم پوچھ رہے تھے کہ سمرقند کی ٹرین کون سے پلیٹ فارم سے جائے گی؟ ایک نوجوان لڑکی نے نفیسہ کی مدد کی اور ایک کنڈکٹر کو بلایا جس کی مدد سے ہم صحیح پلیٹ فارم پر پہنچے اور Russian Made ٹرین کی بوگیوں سے اپنی فرسٹ کلاس سلیپر کو ڈھونڈا اور اندر بیٹھ گئے۔ کنڈکٹر نے آ کر ہمیں تازہ سفید بیڈ شیٹ دیں۔ ہمارا کمپارٹمنٹ دو ہی سلیپر پر مشتمل تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے سلیپر پر بیٹھ گئے۔ ٹرین کافی پرانی تھی مگر بنیادی سہولتیں دستیاب تھیں۔ کھلا کمپارٹمنٹ تھا ٹرین وقت پر روانہ ہوئی۔

شام کا اندھیرا پھیلا ہوا ہے اور ہماری ٹرین تاشقند کو چھوڑ رہی ہے۔ ہم سمرقند کی طرف رواں دواں ہیں۔ یہ سفر تقریباً چار گھنٹے کا ہے اور میں نفیسہ کے سو جانے کے بعد باہر دیکھتا ہوں تو تاشقند کی روشنیاں بھی ختم ہو گئی ہیں اور باہر گھپ اندھیرا ہے۔ ہماری ٹرین فراٹے بھرتی نہ صرف اسلامی بلکہ دنیا کے ایک نہایت اہم شہر کی طرف رواں دواں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سفر کئی دنوں پر محیط ہوتا تھا جب سوداگر شاہراہ ریشم کے ذریعے دولت کمانے اسے استعمال کرتے تھے۔ آج مجھے صرف

چار گھنٹے کے آرام دہ گرم کیبن میں بھی گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اپنے ناشکرے پن پر شرم محسوس ہوئی۔

ریلوے کے کنڈکٹر ان ممالک میں سفر کرنے والے مسافروں سے ٹکٹ چیک کرنے کے بعد ساتھ لے جاتے ہیں اور جب مسافر کا سٹیشن آنے والا ہو تو آ کر ٹکٹ واپس کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بتا دیتے ہیں کہ اگلا سٹیشن آپ کی منزل ہے جو نہایت ہی اچھا طریقہ ہے۔ میں نے نفیسہ کو جگایا اور ہم نے اپنا تمام سامان باندھا اور کنڈکٹر کو بیڈ شیٹ واپس دی اور سمرقند سٹیشن پر اُتر گئے۔ اب رات 12 بج چکے تھے۔ بمشکل باہر کا راستہ ڈھونڈا، تین چار سیڑھیاں اُتریں پھر اُتریں اور پھر چڑھیں۔ باہر آئے ٹیکسی لی اور ہوٹل پہنچے کمرے میں آئے تو کمرہ ٹھنڈا تھا۔ بہرحال انورٹر AC لگا دیا تھا اُمید تھی کہ کچھ وقت میں گرم ہو جائے گا۔ بستر پر لیٹے اور رضائی کے اندر منہ کر کے گرم رکھنے کی کوشش کی مگر صبح تک بھی کمرہ گرم نہ ہوا۔ ناشتہ بھی بالکل ناپسند رہا اور کمرے کی ٹھنڈک کا مسئلہ بھی حل نہ ہوا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ غریب ہوٹل والے گھاٹا نہ کھائیں ہم اُنھیں ساری بُکنگ کے پیسے دے دیں گے مگر ہوٹل تبدیل کریں گے۔ چونکہ سردی برداشت سے باہر ہے اور برف باری شروع ہے اس لیے باہر سیر بھی ممکن نہیں۔

میرے پاؤں یخ ہو چکے ہیں اب دوسرے ہوٹل جانا ناگزیر ہو چکا ہے۔ ہم دوسرے ہوٹل آ گئے ہیں۔ یہاں دو نوجوان لڑکوں اور ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی نے ہمارا استقبال کیا۔ کمرہ دکھایا جو واقعی ہی گرم تھا۔ باہر برف باری جاری و ساری ہے اس لیے ہمیں نئے کمرے میں سکون ملا۔ ہم نے لانڈری کا پوچھا تو بتایا گیا کہ جو کپڑے دھونے کے لیے ہیں انھیں ایک بیگ میں ڈال دیں۔ وہ لڑکی آ کر لے جائے گی اور صبح دھو کر استری کر کے ہمیں دے جائے گی۔ دوپہر تین بجے کے قریب ہم نے باہر جا کر پانی اور باقی اشیاء خریدیں اور لیٹ لنچ کیا۔ تقریباً نو سو گز کے فاصلے پر ہی ہمیں ایک چھوٹا ریسٹورنٹ ملا جو بظاہر ایک فیملی چلا رہی تھی۔ دو مرد کھانا کھلا رہے تھے

اور دو عورتیں کچن میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ کھانا معمولی ہی تھا مگر اس برف باری میں اسی سے کام چلانا تھا اور واپسی پر ہم نے خریداری کی اور مشروبات بھی لیے۔

نفیسہ کمرے میں آرام کے لیے چلی گئی۔ میں نے تھوڑا باہر برف میں چل کر اس تاریخی شہر سے اپنا تعارف کروانا مناسب سمجھتے ہوئے چلنا شروع کیا۔ باہر سوائے نوجوان جوڑوں کے بہت کم لوگ باہر تھے۔ میں چلتا چلتا گورِامیر کے باہر پہنچ گیا۔ یہ تیمور کا مقبرہ ہے۔ وہاں سے معلومات لیں اور واپسی پر مسجد کے پاس سے جہاں امیر تیمور کے اُستاد اور باقی خاندان کی قبریں ہیں گزرا۔ اس سخت سردی میں بھی اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہا تھا کہ اتنی تاریخی جگہ پر موجود ہوں۔ اِن شاء اللہ کل موسم بہتر ہونے پر ان جگہوں کی زیارت ہو گی اور پرسوں بھی باقی جگہوں پر جائیں گے۔ آخر میں امام بخاریؒ کے مزار پر بھی حاضری کا ارادہ ہے۔ سمرقند کی یہ چھ سات سو سال قدیم عمارات تعمیر شدہ نہ صرف اُس وقت کی عالی شان عمارات تھیں بلکہ آج بھی یہ فنِ تعمیر کا نایاب تحفہ ہیں۔ ان سے متاثر ہو کر ہی ہندو پاک میں مغلوں نے تاریخی مساجد، باغات، محلّات وغیرہ تعمیر کروائے بلکہ اکثر اوقات ماہرین تعمیر اور کاریگروں کو بھی خراسان (جو اُس وقت اس جگہ کا نام تھا) سے برِصغیر لے جا کر کام لیا گیا۔

ابھی نہانے سے فارغ ہو کر منگولیا والے کپڑے پہن لیے ہیں۔ وضو بھی کر لیا ہے کیونکہ فاتحہ پڑھنی ہے اور مزارات پر جانا ہے۔ باہر آج برف باری تو رُک گئی ہے مگر 9- ہے اس لیے احتیاط ضروری ہے چونکہ مجھے گھٹنوں میں درد تھا۔ آج کافی پیدل چلنا ہے اس لیے Knee Support بھی پہن لی ہیں۔ ہم امیر تیمور کے مقبرے سے پہلے شیخ برہان الدین کے مقبرے پر گئے جنھوں نے چینی شہزادی سے شادی کی تھی یہاں ان کی اور بیوی بچوں کی قبور ہیں۔ اس کے بعد ہم گورِا میر گئے اور وہاں پر جو سب سے نمایاں قبر ہے وہ میر سید براکا کی ہے۔ امیر تیمور اُن کے شاگرد مرید بتائے جاتے ہیں اس لیے اُن کے قدموں میں امیر تیمور کی قبر ہے۔ ساتھ ہی اُس کے پوتے

اور باقی خاندان کی قبریں ہیں۔

محمد سلطان امیر تیمور کا پوتا تھا اور اُس نے ہی یہ مقبرہ بنوایا تھا۔ خود اس کی اور مرزا اولغ بیگ کی بھی قبریں یہیں پر ہیں۔ یاد رہے کہ اس جگہ پر محمد سلطان نے ایک مدرسہ شروع کر رکھا تھا مگر اس کی بے وقت موت سے امیر تیمور کو سخت صدمہ ہوا اور اُس نے مدرسے کا پروگرام ختم کر کے پوتے کے لیے یہاں مقبرہ تعمیر کرنے کا حکم دیا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی خود چل بسا۔ اسی جگہ پر اپنے اُستادِ محترم میر سید براکا کے قدموں میں دفن ہوا۔ میر سید براکا کے متعلّق زیادہ معلومات موجود نہیں۔ بعض تاریخ دان ان کو خواجہ احمد یساویؒ کا مرید اور ترک النسل بتاتے ہیں۔

جونہی ہم مزار سے باہر آئے اور پروگرام ریگستان جانے کا تھا کہ ایک درمیانی عمر کا آدمی ہمیں انگریزی میں ٹور کی دعوت دیتا ہے۔ ہم نے کہا ہم پیدل یہ سب کچھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر اُس نے ہمیں نہ چھوڑا اور کہا کہ میرا ایک دوست لاہور رہتا ہے۔ میں آپ کو امام بخاریؒ کے مزار پر لے جا سکتا ہوں اور واپسی پر حضرت دانیالؑ کی قبرمبارک اور حضور نبی کریم ﷺ کے بھتیجے حضرت عباسؓ کے مزار مقدس شاہ زندہ بھی لے جا سکتا ہوں۔ ہم نے اُسے امام بخاریؒ کے مزار پر لے جانے کا کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہمارا سفر ایک ایسی ہستی کے مزار کی طرف شروع ہو چکا تھا جنہوں نے احادیث نبوی پر بے مثال کام کیا ہے۔ آج تقریباً بارہ سو سال بعد اُن ہی کی احادیث کو مستند مانا جاتا ہے اُن کے شاگرد امام مسلمؒ کی احادیث کو بھی بہت مانا جاتا ہے۔

ہمارا ڈرائیور ازبکستان کے اکثر ڈرائیوروں کی طرح پیشہ ور ڈرائیور نہ تھا بلکہ پروفیسر بھی تھا۔ وہ مقامی کالج میں موسیقی کی تین دن تعلیم دیتا تھا اور باقی وقت کار چلاتا تھا۔ ہم امام بخاریؒ کے مزار پر حاضری دے کر دو نوافل ملحقہ مسجد میں ادا کر کے واپس کار کی طرف آئے۔ راستے میں ایک خاتون سے تسبیح خریدی کیوں کہ میری تسبیح گُل فراز

کی کار میں ہی ٹوٹ گئی تھی۔ افرسیاب کا علاقہ سمرقند سے ملحقہ ایک نہایت پرانی بستی ہے یہاں کی زمین سطح مرتفع ہے اور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ ان ٹیلوں میں غار وغیرہ بھی بنے ہوئے ہیں جو پرانے زمانے کے لگتے ہیں آج کل ان کو بند کر دیا گیا ہے۔ ایک ٹیلے پر حضرت دانیالؑ کی بہت ہی لمبی قبر موجود ہے۔ اس کے صحن میں ایک چشمہ بھی موجود ہے جس سے ہر آدمی پانی پیتا ہے اور یہ متبرک پانی ہے۔ ایک نہایت خوبصورت نہر بہہ رہی ہے۔ 2010ء سے اس علاقے کی تزئین نو کر کے اور خوبصورت بنایا جا رہا ہے۔

اب ہم واپس سمرقند کی طرف آئے ؛حضرت دانیالؑ سے منسوب چشمے کا پانی پیا اور قبر پر فاتحہ پڑھی قبر بہت ہی لمبی ہے۔ہم نے آج سے 19 سال پہلے شام اور اسرائیل کے بارڈر کے قریب حضرت آدمؑ کے بیٹے کی بہت بڑی قبر دیکھی تھی جو کم از کم 30 گز کے قریب ہو گی۔ مگر یہ قبر تو اس سے بھی دوگنی ہے۔ اس کے بعد ہم شاہ زندہ کے بہت بڑے قبرستان پر پہنچنے سے پہلے ایک یہودیوں اور ہندوؤں کے قبرستان کے پاس سے گزرے تو پروفیسر مقصود نے بتایا کہ یہ یہودی آبادی تھی اور ابھی بھی ہے مگر خاصے یہودی امریکہ اور اسرائیل چلے گئے ہیں۔ یہ قبرستان یہودیوں اور ہندوؤں کا ہے۔ چونکہ امیر تیمور ہندوستان سے کچھ قابل ہندو ساتھ لے آیا تھا اور جب وہ فوت ہوئے تو انہیں اس قبرستان میں یہودیوں کے ساتھ دفن کیا گیا۔

شاہ زندہ اپنی مثال آپ نہایت وسیع و عریض اور پُر وقار قبرستان ہے۔ کیوں نہ ہو آخر یہاں حضور نبی پاک ﷺ کے خاندان کی اُس ہستی کی قبر ہے جن کے متعلق حضور پاک ﷺ کا فرمان ہے کہ میرا چچا زاد قاسم ابن عباسؓ سب سے زیادہ میری مشابہت رکھتا ہے۔ سیدنا قاسم ابن عباسؓ سات سو صدی عیسوی میں یہاں اسلام کی تبلیغ کے لیے تشریف لائے۔ ان کے روضے کے راستے میں دو صوفیوں کے حجرے بھی ہیں۔ امیر حسین (جو تیمور کا ایک جرنیل تھا) کی والدہ، ایک امیر زادے، ترکوں اوکو

(جو تیمور کی ہمشیرہ تھی) کی بیٹی شووی ملک اوکو، تیمور کی دوسری بہن شرین بیکو اوکو، ایک بے نام آدمی اور اوستو علی نسیفی کے مقابر شامل ہیں۔امیر برنک ڈک کا مقبرہ امیر تیمور کی بیوی نے تعمیر کروایا۔ یہ مقبرہ دو کمروں کی مسجد پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد حضرت احمد خواجہؒ کا مقبرہ بھی موجود ہے۔Kutlug Oko جو امیر تیمور کی ایک بیوی تھی اُس کا مقبرہ بھی ہے۔ اب ہم ہوٹل میں واپس آ چکے ہیں اور شام کو ریگستان جائیں گے۔ شام کو سورج غروب ہوتے وقت یہاں کا نظارہ کریں گے اور رات کو روشنیوں میں لطف لینے کے بعد کل دن کو واپس جائیں گے۔فوٹو دن کی روشنی میں لیں گے اور ساتھ ہی اندر جا کر بالتفصیل جائزہ لیں گے۔

شام کو ایک مقامی ریسٹورنٹ سے گزارے لائق ہی کھانا کھا کر ہم نے ریگستان جانے کا پروگرام بنایا تاکہ ان تین تاریخی عمارات کو رات کی روشنیوں میں دیکھیں۔ واہ کیا ہی خوب نظارہ ہے۔ تاریخی نقطہ نظر سے یہ عمارات جب آکسفورڈ اور کیمبرج کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اُس وقت کی ہیں۔ اولگ بیگ نے علمِ فلکیات کے لیے اُس وقت کی نہایت ہی ایڈوانس ابزروٹری بنا رکھی تھی۔ ان مدرسوں میں اُس وقت کی ہر لحاظ سے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ ریسرچ کا کام بھی جاری تھا جو ایک سپر پاور کو اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا اور ہو بھی رہا تھا۔ ان تعلیمی اداروں سے نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ پوری دنیا نے علم سیکھا جن میں اولگ بیگ ریسرچ کا آج بھی لوہا مانا جاتا ہے۔

ہمیں ناشتہ نوجوان لڑکی نے بنا کر دیا جو تقریباً چودہ پندرہ سال کی لگتی ہے مگر پرسوں ہم نے اُسے نرسوں کی طرح کا یونیفارم پہنے دیکھا تو محسوس ہوا کہ شاید 18، 19 سال کی ہو گی۔ ہوٹل ایک فیملی کا ہے جو بظاہر ایک ماں، بیٹی، دو لڑکوں اور خاوند پر مشتمل ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ پورا کنبہ نہایت محنتی اور اچھے لوگ ہونے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں کیونکہ دن کے وقت لڑکے کالج جاتے ہیں۔ ایک

نے بتایا کہ وہ ٹورازم مینجمنٹ کی ڈگری کر رہا ہے۔ لڑکی بھی کوئی کام کرتی ہے۔ ماں بھی کسی اور جگہ کام کرتی ہے اور یقیناً والد کی بھی کوئی جاب ہے کیونکہ وہ صرف صبح کو نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ پورا کنبہ مل کر سلوک و اتفاق سے نہ صرف یہ کہ ہوٹل چلا رہا ہے بلکہ ایک کُل وقتی دوسرا کام بھی کر رہا ہے۔ میری دُعا اور اُمید ہے کہ یہ لوگ اور ترقی کریں۔ یہی محنتی لوگوں کی نشانیاں ہوتی ہیں جو اُن کو کامیاب و کامران کرتی ہیں۔

؎ مشقّت کی ذلّت جنھوں نے اُٹھائی
جہاں میں ملی اُن کو آخر بڑائی

احساسِ زیاں

آج ہم شام کی ٹرین سے بخارا روانہ ہو رہے ہیں۔ ہمارے سفر کا یہ پہلا اتفاق ہے کہ یہاں سے جانے کی جلدی نہیں محسوس ہوئی کیونکہ سمرقند میں ہم نے کافی سکون محسوس کیا ہے۔ رات کو جب ہم گورا میر کے پاس ہی اپنے ہوٹل سے نکل کر ریگستان گئے۔ وہاں سے پیدل واپس آرہے تھے تو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ آج سے کئی صدیوں پہلے ان ہی جگہوں پر مختلف ممالک کے کاروباری حضرات بھی چلتے تھے۔ اپنے گھوڑے اوراونٹ وغیرہ باندھ کر اپنے ساز وسامان کی خرید وفروخت کرتے تھے۔ امیر تیمور اور اُس کے بیٹوں کی بادشاہت کے دوران یہی علاقہ سیاسی وسماجی، کاروباری اور تعلیمی لحاظ سے دنیا کا نمبر 1 علاقہ تھا۔ مختصراً سمرقند میں ہم نے اخلاقی اور روحانی سکون کو بلاشبہ محسوس کیا ہے۔ آج اسے چھوڑ جانے کا تھوڑا سا غم بھی ہو گا۔ ابھی سامان پیک کر کے ہوٹل والوں کے حوالے کیا۔ 12 بجے سے پہلے باہر چلے جائیں گے۔ 7:30 بجے شام کے قریب ٹیکسی میں آکر سمرقند ریلوے سٹیشن پر 9 بجے کی ٹرین سے بخارا روانہ ہوں گے۔

آج کا دن پھر سمرقند کی باقی تاریخی جگہوں میں جانے کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ بدقسمتی سے انٹرنیٹ بند ہے اور ہمیں سخت مشکلات کا سامنا ہے کیوں کہ ہم

نے آئندہ کا لائحۂ عمل طے کرنا تھا۔ہم دن کے وقت ریگستان گئے تو تینوں مدرسوں کا نظارہ کچھ اور ہی تھا۔ بے شک پانچ چھ صدیوں کی موسمی سختیاں برداشت کرنے کی وجہ سے کچھ جگہوں پر شکست و ریخت ہو چکی تھی۔ تینوں مدرسوں یعنی اولگ مدرسہ جو بائیں جانب ہے اور طلاخوری جو درمیان ہے اور شیر دو جو دائیں جانب ہے۔اُن کی آن شان آج بھی قابلِ دید ہے اور اُس وقت کے ماہرِ فنِ تعمیرات، انجینئرز اور کاریگروں کے فن کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک مدرسہ امیر تیمور کے پوتے کے نام پر ہے جو نہایت پڑھا لکھا، ذہین اور جستجو رکھنے والا انسان تھا۔ اس مدرسے کی بنیاد اُس نے اُس وقت رکھی جس وقت وہ سمرقند کا گورنر تھا۔یہاں اُس نے دنیا کی سب سے کامیاب یونیورسٹی قائم کی۔ جب آکسفورڈ اور کیمبرج کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہاں پر اسٹرانومی پر بھی دنیا کے قابل ترین اسٹرانومر پڑھتے اور پڑھاتے بھی تھے جن میں اولگ بیگ خود بھی شامل تھا۔دنیا کی پہلی Observator y اُسی نے قائم کی تھی۔ اُس دور کے ماہرِ فلکیات نے زمین کے محور کی تحقیق کا جو دورانیہ نکالا تھا۔ جدید سائنس اور ماہرِ فلکیات اس میں چند سیکنڈز کا فرق ہی نکال پائے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے وقت سے وہ کتنا آگے تھے۔ ان مدرسوں میں اعلیٰ تعلیم ہر شعبہ زندگی، سائنس اور ریاضی میں دی جاتی تھی۔

اولگ مدرسہ کے ایک نامور گریجویٹ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ ہیں جنہوں نے بعد میں یہاں تدریس کا کام بھی کیا تھا اور بے شمار نامور ہستیوں نے یہاں پر تعلیم حاصل کی۔اولگ مدرسے کے بعد اُس کے سامنے ہی شیر دو مدرسہ تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد طلاخوری مدرسہ اُن کے درمیان بنایا گیا۔ملحقہ مسجد عالی شان بھی بنائی گئی۔ یہ تینوں مدرسے اُس وقت کے آکسفورڈ اور کیمبرج کے مقابل تھے۔ ریگستان کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر بی بی خانم مسجد ہے جو اس خاتون نے تعمیر کروائی۔ یہ نہایت وسیع و عریض اور بہت ہی عالی شان مسجد تھی اور اب بھی قابلِ دید ہے۔ کچھ حصوں کو

دوبارہ تعمیر کرنے کی ضرورت ہے جو جاری بھی ہے۔ یاد رہے کہ 1858ء سے روسیوں نے اُزبکستان کا رُخ کیا اور آہستہ آہستہ اپنے قدم جمانے شروع کر دیے جو بالآخر 1917ء میں مکمّل قبضے کی صورت اختیار کر گئے یوں کیمونسٹ سوویت یونین کا حصّہ بن گئے۔ اس لیے 1992ء تک تقریباً 70 سالہ کیمونسٹ کے قبضے کی وجہ سے زیادہ تر اسلامی ورثہ بے توجہی کا شکار رہا۔ اب بے شک کچھ تزئین نو جاری ہے۔ یہاں پر سبق آموز بات ہے کہ اگر کوئی ملک بھی اپنی زبان، ثقافت اور طرزِ زندگی کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ دوسروں کی زبان و ثقافت اور طرزِ زندگی کو ترجیح دے تو وہ قوم غلام بن جاتی ہے۔ تاریخ نے یہ بارہا ثابت کیا ہے۔ وہی بات یہاں پر اور دوسری ایشیائی مسلمان ریاستوں کے ساتھ ہوئی تھی۔

آج مڈل ایسٹ، پاکستان جیسے مما لک مغرب اور ہندوستانی طرز زندگی کو اور زبان کو اپنانے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا انجام بھی ویسا ہی ہوسکتا ہے کیونکہ تاریخ یہی بات بار بار ثابت کر چکی ہے۔ اُمتِ مسلمہ کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے اور ساتھ تعلیم کی طرف بے توجہی بھی قوموں کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ ہمیں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔ میرٹ کی قدر شعبہ زندگی اور اداروں میں ضروری ہے۔ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو قابل ترین آدمی کو آگے بڑھنے کا موقع دیتی ہیں۔ بعینہٖ اگر ملک کی کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال ٹیم نے بہت سے اہل کھلاڑیوں کو نہ کھیلنے کا موقع دیا تو وہ باقی قوموں کا مقابلہ نہیں سکتی۔ اسی طرح سائنس، ریاضی، فلسفہ، سیاست اور سفارت میں صرف سفارشی ہوں گے تو ملک روز بروز غریب سے غریب تر ہوتا جائے گا۔

بی بی خانم کی مسجد سے ہی کچھ فاصلے پر اس نیک خاتون کا مقبرہ ہے جس میں امیر تیمور کے خاندان کی قبور بھی ہیں۔ حضرت خضرؑ کی مسجد بھی کچھ فاصلے پر موجود ہے جو ایک مختلف طرزِ تعمیر پر بنائی گئی۔ کافی وسیع مسجد ہے اور اس کے ساتھ ہی مشہور

بازار ہے جس میں ہر قسم کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ ہم نے وہاں سے پھل خریدا۔ نفیسہ نے ریگستان سے بہنوں کے لیے کچھ خرید وفروخت کی اور کئی قسم کی گڑیاں بھی خریدیں۔ ہم ایک ATM سے رقم نکلوا کر کھانا کھانے ایک ریسٹورنٹ میں گئے۔ اس کے بعد اپنے ہوٹل پہنچ کر ٹیکسی کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ ہمیں سمرقند ٹرین سٹیشن لے جائے تاکہ ہم بخارا کی ٹرین پکڑ سکیں۔

ہم سمرقند سے فاسٹ افروساب ٹرین میں بخارا کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ جہاں سمرقند چھوڑنے کا دُکھ ہے وہیں اب بخارا دیکھنے کا اشتیاق زیادہ ہے۔ ہماری ٹرین بروقت بخارا پہنچ چکی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سفر جو ہم نے بذریعہ تیز ٹرین میں ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا ہے۔ یہ پرانے وقت کے شاہراہِ ریشم کے بیوپاری کئی دنوں میں طے کرتے رہے ہوں گے۔ آج یہاں پر 6- ڈگری کی سردی ہے جو ہوا کی وجہ سے دوگنی محسوس ہوتی ہے تو مجھے اُس وقت کے لوگوں کی جانفشانی کی داد دینی پڑ رہی ہے۔

جونہی ہم سٹیشن سے باہر آئے ہیں تو ڈرائیور ہوٹل کے نام کی تختی اُٹھائے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں جلدی جلدی کار پارک تک لے آیا اور گاڑی میں سامان رکھ کر بٹھایا۔ ہوٹل تقریباً 18 کلو میٹر دور ہے سٹیشن سے۔ ہمیں اس چھوٹے سے سفر کی پروا نہیں تھی اور خاص کر جبکہ ہمارے ہوٹل سے صرف 100 گز کے فاصلے پر پرانا بخارا ہے جہاں بخارا کی تاریخی عمارات ہیں۔ ہم رات کو اپنے کمرے میں آئے تو سکون ملا کہ کمرہ گرم تھا باہر تو سردی کا خوب زور تھا مگر ہم آرام سے سو گئے۔ صبح ناشتے کے بعد بخارا کے تاریخی مقامات کی سیر کو نکلے۔ ابھی ایک جگہ ہی دیکھی تھی کہ ایک صاحب ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں حضرت بہاء الدین نقشبندیؒ کے مزار پر لے جانے کی پیش کش کی تو ہم نے پہلے وہاں جانا ہی مناسب سمجھا۔ قصرِ عارفین جو تقریباً 12 کلو میٹر باہر ہے چلے گئے اور وہاں جا کر فاتحہ خوانی کی۔ حیرانی اس بات پر ہوئی کہ قبر کھلی جگہ ہے۔ اُس پر

کوئی عمارت نہیں۔ یاد رہے کہ یہ ایک بہت بڑے ولی اللہ کی درگاہ ہے جہاں سے نقشبندی سلسلے کی ابتدا ہوئی۔ یہی بزرگ ہستی امیر تیمور کو بھی اس کے دور میں ہدایات دیتے تھے۔ اُن کی ہدایت پر ہی اُن کو باغ میں دفن کیا گیا۔ نقشبندی سلسلے کی ایک انوکھی بات ہے کہ یہ سلسلہ ظاہری بیعت کو ضروری نہیں گردانتا جو اکثر صوفی سلسلوں میں ہے۔

بہاء الدین نقشبندی 30 نومبر 1327ء کو قصرِ عارفین بخارا میں پیدا ہوئے۔ آپ صوفی سلسلۂ نقشبندیہ کے بانی تھے۔ یہ سلسلہ پوری دنیا میں خاصا مقبول اور بڑا مانا جاتا ہے۔ سلسلۂ مجددیہ، سلسلۂ خالدیہ، سلسلۂ سیفیہ اس کی معروف شاخیں ہیں۔ بچپن ہی سے آپ کی پیشانی پر آثارِ ولایت و ہدایت نمایاں تھے۔ آپ کی ابتدائی روحانی تربیت بابا سماسی نے کی اور بعد میں آپ کو سید امیر کلال کے سپرد فرمایا۔ گو آپ نے ظاہری طور پر طریقت کی تعلیم و تربیت سید امیر کلال سے حاصل کی لیکن آپ کی روحانی تربیت قطب عالم عبدالحق غجدوانی نے اویسی طریقے پر فرمائی۔ آپ کا وصال 21 فروری 1390ء میں 63 برس میں آبائی گاؤں قصرِ عارفین میں ہوا۔ یہ بخارا کے قابلِ ذکر مقامات میں شامل ہیں۔ مشہور ہے کہ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے جنازے کے سامنے یہ شعر پڑھا جائے:

؎ مفلسانیم آمدہ در کوئے تو
شیئا للہ از جمال روئے تو

ترجمہ: میرے مولا! میں ایک مفلس کی حیثیت سے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ خدارا اپنا جلوہ جہاں آرا دکھا دیں۔

ہم واپس بخارا روانہ ہوئے تو سڑک کے دونوں جانب برف سے منجمد درختوں کی شاخیں سفید تھیں اور کھیتوں میں کپاس کے پودے بھی سفید نظر آرہے تھے۔ واپس بخارا میں آکر مختلف مدارس دیکھے جن میں مدرسہ امیر عرب، مدرسہ اولغ بیگ،

مرزا اولغ بیگ کی سرائے، کوکل دوش مدرسہ، سمانید محمد سلیم، چار مینار، کالون کا مینار، پوئے کلیاں مسجد، لسیاب حوض وغیرہ شامل ہیں۔ بخارا اور سمرقند کے مدرسے اپنے وقت کی بہترین درس گاہیں تھیں جہاں پر دنیا کی نہایت جدید تعلیم اور ریسرچ کے سنٹر تھے۔ یہ درس گاہیں موجودہ Harvard University اور Yale University کے ہم پلہ تھیں۔

آخر میں ہم نے آرک آف بخارا دیکھا جو ایک قلعہ ہے جس کی علیحدہ قسم کی عمارت ہے جو دنیا میں منفرد ہے۔ یہ قلعہ شہر کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے کا کام دیتا رہا ہے۔ ہمیں کھانے کا مسئلہ ہے۔ میں گندم اور دودھ کی بنی ہوئی کوئی چیز نہیں کھا سکتا۔ یہاں کا پلاؤ بہت زیادہ تری سے بھرپور ہوتا ہے حتیٰ کہ فرنچ فرائز بھی تیل میں تر ہوتا ہے۔ آج صرف شوربا یعنی سوپ سے کام چلایا ہے تاکہ طبیعت پر بوجھ نہ بنے۔

آج ہم بذریعہ ٹیکسی خوارزم (Khiva) روانہ ہو رہے ہیں۔ ہمارے ڈرائیور صاحب صبح 9 بجے آگئے تو ہم نے کہا کہ وقت دس بجے کا ہے اس لیے انتظار کریں تاکہ ہم ناشتہ کر کے تیار ہو سکیں۔ ناشتہ حسبِ سابق کیا؛ گاجر کا مربہ یا حلوہ جو بھی تھا؛ نہایت مزیدار پایا؛ تازہ پھل بھی کل سے زیادہ میرے سامنے رکھے گئے۔ یہ بھی ایک فیملی کا ہوٹل تھا جس میں بیوی بیٹی کچن کا کام کرتی تھیں اور خاوند باہر کا کام کرتا تھا۔ اس فیملی کو بھی سب نے خدا حافظ کہا۔ اُن کو بتایا کہ ہمارے ڈرائیور کو خوارزم کے ہوٹل کا پتہ بتا دیں کیونکہ یہ انگریزی نہیں جانتا۔ جب ہوٹل والے نے اس سے پوچھا کہ خوارزم کو جانتے ہو تو پتہ چلا کہ ہمارا ڈرائیور کبھی خوارزم گیا ہی نہیں۔ بہر حال سامان گاڑی میں رکھ کر بخارا کو خدا حافظ کہا۔

خوارزم کی طرف چلے تو پتہ چلا کہ موصوف کے پاس Sat-Nav بھی نہیں۔ خیر ہماری گاڑی خوارزم کی طرف گامزن ہے۔ درختوں کی شاخیں سفید تھیں کیونکہ آج بھی درجہ حرارت 6- ہے۔ سردی سے ہر چیز جمی ہوئی ہے۔ دھوپ نکلی ہوئی ہے اور دل کش

صبح ہے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیت ہیں جن میں کچھ کپاس کی فصل کے اور بچے کچے پودے ہیں۔ کچھ کھیت نئے نئے ہل چلائے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں کوئی نئی نئی سرسبز چیزیں اُگنا بھی شروع ہوئی ہے۔ برف اور کہرے کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ابھی ابھی ایک گدھا گاڑی پر چار عورتیں اور دو مرد بیٹھے ہوئے گزرے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی چرواہا چند بھیڑوں کو ہانکتا نظر آتا ہے۔ چند عورتیں کپاس کی باقیات اُٹھاتی نظر آتی ہیں۔ سڑک نہایت خراب ہے اور پاکستان کی سڑکوں کی یاد دلا رہی ہے اور ڈرائیور کو خاصی مشکلات پیش آرہی ہیں۔ آگے جا کر ہم خواجہ علی رومتانی کے مزار سے گزر رہے ہیں۔

سڑک کی حالت بہتر نہیں ہو رہی۔ ڈرائیور نے ایک جگہ پیٹرول سٹیشن سے پہلے ہمیں کہا کہ گاڑی سے نکل جائیں۔ سامنے ایک کیفے میں بیٹھ جائیں اور وہ کچھ کر کے واپس آئے گا۔ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی؛ پھر بھی ہم اُس کے حکم کی پابندی کرتے ہوئے چھوٹے سے کیفے میں چلے گئے۔ ایک عمر رسیدہ خاتون نے پوچھا تو کہا کہ چائے پئیں گے۔ چائے آگئی؛ نفیسہ نے پیسٹری اور بسکٹ کا انتخاب کر لیا۔ اُس خاتون نے خشک میوہ جات کا ایک لفافہ دیا جو میں نے قبول کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ بمشکل سمجھ پائے کہ خاتون مجھ سے عمر پوچھ رہی تھی تو میں نے بتایا 72 سال ہے تو اُنہوں نے اپنی عمر 65 سال بتائی۔ ہمارا ڈرائیور گاڑی لے کر آگیا اور ہم خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ہم نہایت تیزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ سڑک بہتر ہوگئی۔ کم از کم سو سے زیادہ کلومیٹر تک کوئی آبادی نظر نہ آئی سوائے کوئی کچا کمرہ جو دس بیس کلومیٹر پر نظر آجاتا ہے۔ ایک طرف گھر کے باہر ایک گائے بھی نظر آئی۔ ورنہ میل ہا میل تک آبادی نظر آتی ہے اور نہ ہی کوئی فصل۔ زمین بالکل ہموار اور تھوڑی ریتلی ہے مگر کاشت نہیں کی گئی۔ سڑک نئی بنی ہوئی ہے اور بالکل سیدھی ہے کہ بیک وقت

بیس پچیس میل تک سیدھی سڑک دیکھی جا سکتی ہے۔ ایسے میں ڈرائیونگ بہت مشکل ہوتی ہے اور یہی ہمارا ڈرائیور بھی محسوس کر رہا تھا۔ اُسے شاید نیند آرہی ہے کیونکہ وہ بار بار گردن ہلا رہا تھا۔ میں نے ایک دفعہ دیکھاتو وہ مجھے الرٹ نہ لگا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ تھوڑا آرام کر لے کیونکہ سفر شروع کیے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ اُس نے کہا نہیں آرام نہیں کرنا کیونکہ مجھے واپس بھی آنا ہے۔

میں نے آفر کی کہ میں تھوڑی دیر گاڑی چلا سکتا ہوں۔ کیوں کہ سڑک نئی اور بالکل سیدھی تھی اور ابھی 350 کلومیٹر کا سفر باقی تھا مگر وہ نہ مانا۔ اب میں نے اُسے باتوں میں لگانا شروع کیا جو زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے خاصا مشکل کام تھا۔ بالآخر ہم ایک پیٹرول پمپ پر رُکے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ گاڑی گیس پر بھی چلتی ہے۔ اب اسے گیس کی ضرورت ہے۔ ہمیں اُس نے ایک بار پھر گاڑی سے نکلنے کو کہا تو ہم نکل کر کیفے میں چلے گئے۔ اب ہمیں معلوم ہوا کہ جب گاڑی میں گیس بھری جا رہی ہو تو ڈرائیور اور مسافروں کو گاڑی سے نکلنا پڑتا ہے۔

سڑک پھر خراب آنا شروع ہو گئی اور ہمارے ڈرائیور صاحب بار بار پوچھ رہے ہیں کہ راستہ کون سا ہے؟ تھوڑی دور جا کر گاڑی کھڑی ہو گئی۔ پیٹرول کی سوئی خالی ٹینک بتا رہی تھی حالانکہ گاڑی گیس پر چل رہی تھی۔ ڈرائیور خاصا پریشان ہو گیا۔ میرے کہنے پر کہ گاڑی میں تھوڑا پیٹرول ڈلوا کر دیکھیں کہ واقعی گیج خراب ہے۔ کہیں پیٹرول ہی سارا استعمال نہیں ہو گیا مگر ڈرائیور نے میری نہ مانی۔ ایک بار پھر ہوٹل والوں کو فون کر کے راستے پوچھتا رہا مگر کام نہ بنا۔ اب مجھے ڈرائیور پر ترس آرہا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی کے قریب گاڑی کھڑی کر کے ٹیکسی ڈرائیور سے راستہ پوچھ رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی تو میں نے نئے ٹیکسی ڈرائیور کو کہا کہ وہ ہماری گاڑی کے آگے اپنی گاڑی لگائے۔ ہوٹل تک لے جائے میں اُس کا بھی کرایہ ادا کروں گا مگر وہ نہ مانا تو تھوڑی دُور جا کر ایک دوسرا ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ہوٹل لے جانے پر راضی ہو گیا۔ ہم نے ڈرائیور

کو خدا حافظ کہ اور ایک لاکھ سوم کی ٹپ بھی دی تاکہ وہ اپنی گاڑی بھی مرمت کروا سکے:

ے خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

اس کے تقریباً 45 منٹ کے بعد ہم ہوٹل پہنچ کر بہت خوش ہوئے۔ ہوٹل پرانے خوارزم شہر کے قلعے کے اندر ہے اور سب تاریخی مدارس، مسجد اور باقی پرانی عمارات کے بالکل ساتھ ہے۔ ہوٹل میں رہنے سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم چھ سات صدیاں پہلے اس شہر میں ہیں۔ ہوٹل بھی اعلیٰ ہے اور سٹاف انگریزی بھی بول سکتا ہے۔ شام کو نزدیکی ریسٹورنٹ میں اچھا کھانا کھایا۔ آج شائستہ کی طبیعت خراب سن کر طبیعت بوجھل ہو چکی ہے۔ رئیسہ نے شائستہ کے ڈاکٹر سے مفصّل بات چیت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ تھوڑا بہتر محسوس کر رہی ہیں۔

آج صبح قابوس حسین اور اس کے بعد شائستہ سے بھی رابطہ ہوا ہے۔ اُس کو اور اہلیہ رضیہ کو ہدایات دی ہیں۔ خوارزم کے قلعہ بند علاقے میں جہاں پر پرانا شہر تھا اور بہت سے مدارس ہیں شاہی خاندان کی رہائش اور مسجد شامل ہے۔ سب میں گئے اور قابلِ ذکر باتوں کے علاوہ مسجد کا طرزِ تعمیر شان دار ہے۔ تمام کام لکڑی کو استعمال کر کے کیا گیا ہے اور مسجد کے مرکزی ایریا میں لکڑی کے ستونوں کا شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ ایک دفعہ پھر یہاں کے بے شمار مدارس جن میں یعقوبی خواجہ مدرسہ، محمد رحمیون مدرسہ، قاضی کامون مدرسہ، سید علاء الدین مدرسہ، محمد امین مدرسہ، شیر گوانران مدرسہ اور مدرسہ مرزم شامل ہیں۔ عبدالعزیز غازی محمد رحیم خان اور خواجہ علاء الدین نیک ہستیاں ہیں۔ پہلوان محمود جو نہ صرف بہت بڑے پہلوان تھے بلکہ ایک بڑے بزرگ اور فلسفی تھے۔ انہیں پہلوان عطا اور حضور پہلوان پیر کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ اُن کا مزار بھی ہے جہاں بہت سے اُزبک زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اُن کا مشہور قول

ہے کہ میرے لیے کوہ قاف کو توڑنا مشکل نہیں۔ میرے لیے دل کا خون آسمان کو لگانا آسان ہے۔ میرے لیے سو سال کی قید کاٹنا آسان ہے مگر میرے لیے بے وقوف شخص کے ساتھ ایک لمحہ گزارنا مشکل ہے۔ ان کا مقبرہ رحیم خان اوّل اور اُن کے بیٹے اللہ قلی خان نے تعمیر کروایا۔ خیرہ شہر سید نیاز شاہ کاری مسجد دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔

نماز جمعہ باجماعت ادا کرنے کی سعادت کے بعد واپس ہوٹل پہنچے پھر سیدھے ٹیکسی میں بیٹھ کر urgench روانہ ہوئے جو خورازم کے ساتھ ہی ایک نیا خوبصورت اور کاروباری شہر ہے۔ جہاں پر ایئرپورٹ سے ہمیں Ural Air Ways کی پرواز سے ماسکو روانہ ہونا ہے۔ جلال الدین خوارزم شاہ کی یادگار کے علاوہ Urgench خوارزمی کی جائے پیدائش ہے جنہوں نے الجبرا ایجاد کیا۔آپ اپنے وقت کے بہت بڑے ریاضی دان، ماہرِ فلکیات اور جغرافیہ دان بھی تھے۔

ہماری فلائٹ اس چھوٹے سے ایئرپورٹ سے وقت پر روانہ ہوئی۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ تقریباً 90 فیصد مسافر ہمیں مزدور طبقہ کے محسوس ہوئے۔ بعد میں میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے مسلمان اُزبک نے مشترکہ زبان نہ ہونے کے باوجود بھی سمجھا دیا ہے۔ چونکہ وہ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا فلائٹ کے شروع ہونے سے پہلے دُعائیں مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جب فلائٹ رن وے پر پرواز کرنے والی تھی تو میں نے دُعا پڑھی تو اُسے یہ پتہ چل گیا کہ ہم بے شک زبان نہیں سمجھ سکتے مگر ہمارا دین مشترک ہے۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ وہ ماسکو کے بعد سائبیریا جائے گا جہاں پر اُس کا کام کھدائی کا یا برف ہٹانے وغیرہ کا ہے۔ وہ اشارے سے مجھے بیلچہ بتا رہا تھا۔ اُس نے اپنے فون سے اپنی بیوی، بچوں اور ماں کی تصاویر دکھائیں اور ساتھ ہی اپنا گھر جو مٹی کا معمولی سا گھر تھا؛ جس میں اُس نے ایک گائے دکھائی اور چند بھیڑیں بھی۔

یہ اُس کی غریب فیملی تھی جن کی کفالت کے لیے وہ سائبیریا جو دنیا کا سرد ترین علاقہ ہے مزدوری کے لیے شاید ایک ماہ یا ایک سال کے لیے جا رہا تھا۔ یقین نہیں کہ

اتنے دور کم از کم ایک ماہ کے لیے جا رہا ہو گا۔ مجھے اپنا ملک ایسے ہی حالات میں آج سے 55 سال پہلے چھوڑنا یاد آیا اور اُس شخص کے لیے دل سے دُعائیں نکلیں۔ ہمارے پاس جتنی اُزبک کرنسی تھی ہم نے اُسے ماسکو ایئر پورٹ پر دے دی۔ اسے کہا کہ اب یہ ہمارے کام کی نہیں ہے۔ پلیز تم لے لو جو اُس نے لے لی۔ ہم نے اُسے خدا حافظ کہہ کر اپنا راستہ پکڑا۔

ے کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

ہماری اگلی فلائٹ آذر بائیجان ایئرویز کی تھی۔ اس لیے سامان کا ٹرانسفر ضروری تھا ہم ٹرانزٹ مسافر تھے۔ ہمارے پاس روس کا ویزا تھا نہ ہمیں ضرورت تھی۔ صرف یہ گتھی سلجھانی تھی کہ ہمارا سامان کون وصول کرے گا اور پھر چیک اِن کرائے گا۔ ریسپشنسٹ بہت اچھی تھی جس نے ہمارے پاسپورٹ اور سامان کے ٹیگ لیے۔ 10 منٹ بعد ہمیں نئے بورڈنگ پاس مع نئے Luggage ٹیگ دے کر بتایا کہ ہمارا سامان ہمیں باکو ایئر پورٹ پر مل جائے گا۔ ویسا ہی ہوا؛ ہم اُس کے بعد امیگریشن والوں کے پاس پہنچے تو ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ جب ہم سے سوال شروع ہوئے۔ ہم نے زندگی میں خاصے ہوائی سفر کیے جہاں ٹرانزٹ مسافر تھے۔ ٹرانزٹ مسافروں کی کبھی امیگریشن ہوتی ہی نہیں کیونکہ اُس نے ملک میں داخل ہی نہیں ہونا ہوتا صرف جہاز بدلنا ہوتا ہے۔ بہر حال دو خاتون تفتیشی افسر بہت متجسّس تھیں کہ آخر ہم اتنے مما لک میں کیوں سفر کر رہے ہیں؟ اتنے عرصے سے ہمارا سفر جاری ہے جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ انگریزی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم اُنہیں سمجھا بھی نہیں سکتے تھے۔

اُنھوں نے پھر اپنے سینئر کو بلایا جو انگریزی بول سکتا تھا۔ وہ بھی وہی سوال دوہرا رہا تھا کہ ہم کیوں اتنے مما لک میں گئے ہیں؟ میں نے اُنہیں بتایا کہ اوّل: تو ہم ٹرانزٹ مسافر ہیں ہم روس میں داخل نہیں ہوں گے اور دوم: ہمارے پاس آذر بائیجان کا

پاس پڑا ہے جو اُسے دکھایا۔ اس کے باوجود اُس کی سمجھ میں بات نہیں آرہی تھی کہ اگر میں پاکستان پیدا ہوا ہوں تو برٹش کیسے ہو گیا؟ نفیسہ اور میں اتنے لمبے سفر کیوں کر رہے ہیں؟ نفیسہ سے نوکری کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ماہرِ نفسیات ہے اور اپنے لیے کام کر رہی ہے۔ میں نے بتایا کہ میں کمپنی ڈائریکٹر ہوں اس لیے نوکری پر اپنی مرضی سے جا سکتا ہوں۔اُس کے بعد دو آفیسر اندر آئے؛ آخر میں اُن کی تسلّی ہوئی؛ ہماری جان چھوٹی اور ڈیپارچر لاؤنج پہنچے۔ اپنی فلائٹ پکڑ کر صبح 4:30 باکو ایئرپورٹ پر پہنچے جو نہایت خوبصورت ایئرپورٹ ہے۔ ہوٹل کی گاڑی کا ڈرائیور ہمارا انتظار کر رہا تھا اور ہم ہوٹل پہنچ کر 5:30 سو گئے۔

آج گیارہ بجے جاگ کر باہر گئے؛ ناشتہ کیا ہے اور کیسپین سمندر کے کنارے سیر کی۔تبلیسی کے لیے ریلوے کے ٹکٹ خریدے اور باکو کی سیر کی۔نظامی سٹریٹ ضروری شاپنگ کی مرکزی گلی ہے۔ہم نے سیر کے دوران محسوس کیا کہ باکو میں خاصی تعداد میں نوجوان اور درمیانی عمر کے پاکستانی اور ہندوستانی ہیں۔ رات کو ہم نے ایک پاکستانی ریسٹورنٹ ہی میں خوب دال چاول اور بریانی کے مزے لیے۔یہ ہوٹل لاہور کی ایک خاتون وجیہہ اور اُن کی فیملی چلا رہی ہے۔ اچھے لوگ تھے؛ کھانے اور گپ شپ سے خاصے لطف اندوز ہوئے۔ شام کو ایک بار پھر تھوڑی چہل قدمی کے بعد ہوٹل میں آکر آرام سے سو گئے۔

یکم دسمبر کی باکو میں ایک دل کش صبح ہے۔ ابھی ہوٹل میں چائے سے لطف اندوز ہوئے اور سامان کی پیکنگ مکمّل کرنے کے بعد باہر جا کر قدیم باکو کا نظارہ کرنا ہے۔ یاد رہے کہ اسلام کے یہاں آنے سے پہلے یہ لوگوں مدتوں آگ کے پجاری رہے اور ابھی تک کچھ لوگ اسی مذہب کو مانتے ہیں۔یہ شہر اب نہایت ماڈرن شہر ہے۔تاریخی حصہ Old Town ہی ہے۔ یہاں پر شیرواں شاہ کا محل، نامکمّل دیوان خانہ، قلعہ اور مسجد ہے۔ اس شہر کو بارہویں صدی میں جب پہلا دارالحکومت شماخہ زلزلے

سے تباہ ہو گیا تھا بسایا گیا اور دارالحکومت کا درجہ دیا گیا۔ بیسویں صدی میں تیل کی دریافت کے بعد آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ نئے آذربائیجان کا لیڈر حیدر علی ہے جس کے نام پر ایئرپورٹ کے ملحقہ اور بھی بہت سی جگہوں کے نام رکھے گئے ہیں۔ فرخ یاسر نے 35 سال بادشاہت کی اور بہت عمدہ کام کیے۔ اُس نے دو بڑی طاقتوں روس اور سلطنتِ عثمانیہ سے اچھے تعلّقات رکھے اور اپنے نام کے سکہ بھی جاری کرائے۔ اُس کی جنگ میں ہی موت ہوئی۔ شیرواں شاہوں کی حکومت 1558 میں ختم ہوگئی۔

ہم نے بہترین لنچ کیا تھا اس لیے شام کو صرف چائے ہی پی اور باکو ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ ہماری ٹرین وقت پر 8:40 تلبیسی کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔ ہم اپنے فرسٹ کلاس کے کیبن میں مع سامان کنڈکٹر کی مدد سے پہنچ چکے ہیں۔ لیڈی کنڈکٹر ہمیں بیڈ شیٹ اور سرہانے دے چکی ہے۔ ہماری ریل درمیانی رفتار سے سفر جاری رکھے ہے۔ ہم باکو کو خدا حافظ کہہ چکے ہیں۔ ابھی کسی اور شہر کی روشنیاں کھڑکی سے نظر آرہی ہیں۔ ہماری ریل یہاں پر نہیں رُک رہی۔ اگلے دونوں ممالک غیر مسلم ہیں۔ ہم اسلامی تاریخ کے ایک قابلِ ذکر دور کے ممالک کو چھوڑ چکے ہیں میں یہ بات ریکارڈ کرنا انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمان ممالک اور بالخصوص پاکستان اس بات پر خاص توجہ دیں کہ آج کل کی تاریخ غیر مسلم لکھ رہے بلکہ پرانی تاریخ بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ انٹرنیٹ پر یہودیوں اور ہندوؤں کی آج کل اجارہ داری ہے۔ وہ جو کچھ لکھیں گے وہی آئندہ آنے والے غیر مسلموں اور مسلمانوں کی بھی تاریخ سمجھی جائے گی۔

حکومتی سطح پر اس تاریخی ورثے کی حفاظت فرضِ عین ہے۔ کیا یہی کافی نہیں کہ وقفے وقفے سے کسی مسلمان دہشت گرد کو بجائے زخمی کر کے تفتیش کرنے کے مسئلے کی جڑ تک کیوں نہیں جایا جاتا۔ اُسے ہمیشہ مار کیوں دیا جاتا ہے؟ ایک سزا یافتہ برطانوی دہشت گرد کو لندن برج پر راہگیروں نے قبضے میں کر رکھا تھا۔ جب پولیس کے حوالے کیا گیا تو پولیس نے گرفتار کرنے کی بجائے جان سے مار دیا۔ اب اُس کے

ساتھ اور ملوث لوگوں کا کیسے پتہ چلایا جائے گا؟ یہ کام بار بار ہو رہا ہے۔ حالانکہ پولیس کے شارپ شوٹر اچھی طرح جان سے مارے بغیر انسان کو وقتی طور پر معذور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے واقعات مسلسل 2001ء سے جاری ہیں اور تاریخ کا حصّہ بن رہے ہیں۔

باہر اندھیرا ہے اور ہماری ٹرین اب فراٹے بھرتی جا رہی ہے۔ گاڑی رات بھر چلتی رہی کبھی آہستہ کبھی تیز بعض اوقات تھر تھرا کر چل رہی تھی۔ بعض اوقات نہایت آرام دہ انداز میں لیڈی کنڈکٹر پوری رات ڈیوٹی دیتی رہی میں نے کچھ وقت سوتے اور کچھ جاگتے گزارا ہے۔ ابھی ابھی لیڈی کنڈکٹر زور زور سے سب فرسٹ کلاس کیبنوں کے دروازے کھٹکھٹا رہی ہے۔مطلب جگانا تھا کیونکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ 5 بجے صبح کے قریب بارڈر آئے گا اور اب 5:15 ہو گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امیگریشن قریب ہے اور ہوسکتا ہے کہ آفیسر اب ہماری گاڑی میں موجود ہوں۔ دونوں ممالک کی امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہونے کے بعد اب ہماری ٹرین تلبیسی کی طرف روانہ ہوئی ہے۔تقریباً ایک گھنٹے کا سفر اب باقی ہے۔ باہر بادل چھائے ہوئے ہیں اور زمین بالکل ہموار ہے۔ اب تھوڑی دور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی نظر آنا شروع ہوئی ہیں۔ ٹرین لائن کے ساتھ ساتھ تقریباً 100 گز تک درخت لگائے گئے ہیں جو یقیناً موسم بہار اور سرما میں پیارے لگتے ہوں گے۔ بھیڑوں کا ایک ریوڑ مع دو چرواہے (جو گھوڑوں پر سوار ہیں) ابھی گزر رہا ہے۔ ایک پسماندہ ملک نظر آ رہا ہے۔ روسی پرانے ٹرک جگہ جگہ ہیں۔ ہم اس وقت جس ایریا سے گزر رہے ہیں یہاں سے کباڑ خانے ہی نظر آ رہے ہیں اور جگہ جگہ پرانے خالی گھر اس بات کا ثبوت ہیں کہ اپنی زندگی بہتر بنانے کے لیے ان کے مکین نقل مکانی کر چکے ہیں۔

ہم ٹیکسی سے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے اور ٹیکسی میں اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔تھوڑی دیر آرام کے بعد ہم تلبیسی کی سیر کو نکلے تو یہ بات واضح ہوئی کہ یہ شہر شاید ایک صدی

کے قریب پہلے ایک درمیانے درجے کا شہر رہا ہے۔ اس کی پرانی عمارت کی عالی شان تعمیر سے واضح ہے مگر اب یہ بوسیدہ کھنڈرات کا منظر پیش کرتی ہیں۔ میرے خیال میں امیر لوگوں نے اس وقت کے حساب سے خوب صورت عمارات تعمیر کی تھیں۔ پچھلی صدی سے کیمونسٹوں کے نظام کی وجہ سے متوسط طبقہ شاید یہ ملک چھوڑ گیا ہے۔ کیمونزم میں عمارات کی دیکھ بھال مناسب طریقے سے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی حالت نہایت خراب ہے۔

دوسری قابلِ ذکر بات یہ دیکھی کہ زیادہ تر آبادی بوڑھے لوگوں کی ہے۔ شاید نوجوان پڑھے لکھے لوگ دوسرے ممالک میں جا کر برتر معیارِ زندگی کی تلاش میں چلے گئے ہیں۔ ایسا ہی میں نے مشرقی جرمنی میں دیکھا جب نوجوان طبقہ مغربی جرمنی کے شہروں میں کام کی غرض سے چلا گیا تو باقی بوڑھے، بچے اور درمیانی عمر کی عورتیں فلیٹوں میں رہ گئیں۔ یہ ملک بہت غریب ہے اور بوڑھوں کی حالت بدتر ہے۔ شہر میں قابلِ ذکر چیزوں کی کمی ہے۔ ہم نے ایک ریسٹورنٹ پر فش چپس اور برٹش جھنڈا دیکھ کر اُس کا رُخ کیا۔ وہاں پر فش اینڈ چیپس ہی کھائے۔ اس سٹریٹ میں ریسٹورنٹ ہی ریسٹورنٹ ہیں۔ فٹ پاتھ پر ہر ریسٹورنٹ کے باہر کوئی لڑکا یا لڑکی کھڑے تھے جو ہمیں ریسٹورنٹ میں آنے کی دعوت دیتے تھے۔ ہم معذرت کرتے کرتے تھک گئے کیونکہ پوری سٹریٹ پر صرف ریسٹورنٹ ہی ہیں۔

اگلے دن ناشتے کے بعد ہم باہر نکل پڑے۔ مدر آف جارجیا، فریڈم اسکوائر اور پیس برج اولڈ سٹی وغیرہ کی سیر کی۔ تاج محل ریسٹورنٹ میں پاکستانی کھانوں سے لنچ کیا۔ شام کو ایرانی ریسٹورنٹ کا کھانا کھائیں گے۔ ہم اس پل سے گزر رہے ہیں۔ ابھی ابھی کیبل کار سے اترے ہیں۔ سورج غروب ہونے کو ہے اور ہم مدر آف جورجیا کا مجسّمہ دائیں طرف دیکھ رہے ہیں۔ بیچ دریا بہہ رہا ہے اور سورج اپنی آخری کرنیں بکھیر رہا ہے۔ یہ دل فریب منظر یادگار رہے گا۔ ہم کھانا کھا کر واپس ہوٹل پہنچے؛

ٹیکسی آرڈر کی اور اپنا سامان لے کر ریلوے سٹیشن پہنچ چکے ہیں۔ ابھی ٹرین چلنے میں آدھ گھنٹہ ہے اور ہم یہاں کے مقامی لوگوں کی چہل پہل دیکھ رہے ہیں۔ سٹیشن کے ساتھ ایک شاپنگ مال بھی ہے اور اسی کی وجہ سے لوگوں کا رش ہے۔ تھوڑی دیر میں ہمارا آرمینیا کا سفر شروع ہونے کو ہے۔ یہاں کی یادیں جن میں غربت، ٹور سلیکٹرز اور ریسٹورنٹ کے باہر کھڑے لوگوں کی روزی کمانے کے لیے انتہائی کوششیں یاد رہیں گی۔ دریا کے کنارے پرانی کتب، تمغے، پرانے زیورات، انگوٹھیاں، پرانے گھریلو سامان کی دکانوں کی بہتات بھی یاد رہے گی۔ اُمید ہے کہ چند سالوں میں ان لوگوں کے حالات بھی بہتر ہو جائیں۔

ریل پرانی روسی ساخت کی تھی۔ فرسٹ کلاس وسیع کیبن تھا اور دونوں Sleeper بھی ٹھیک ہی تھے مگر سب کچھ بنیادی ہی تھا۔ ہماری گاڑی تلبیسی سے روانہ ہو رہی ہے اور ہم اس شہر کی روشنیوں کو پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ تقریباً 12:30 کو کسٹم اور امیگریشن حکام نے گاڑی کلیئر کر دی۔ ہم بارڈر کی طرف رواں دواں ہوئے۔ 3:00 بجے کے قریب آرمینیا کے حکام نے چیک کیا اور مجھے برٹش پاسپورٹ کی وجہ سے ریل سے باہر نکل کر ایک کیبن میں مہر لگوانی پڑی۔ ابھی صبح کی روشنیاں آنے میں کچھ دیر ہے۔ ہماری گاڑی Yearvan کے سٹیشن میں داخل ہوگئی ہے اور ہم اُتر کر ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل پہنچے ہیں۔ ہماری بکنگ 2 بجے دوپہر کی تھی اور ہم نے اسے آخری وقت پر بدلا تھا۔ ہمارا کمرہ ابھی تیار نہ تھا اور فی الحال ایک دوسرا کمرہ دیا گیا۔ ہمارا کمرہ 11:00 بجے تبدیل ہوا اور ہم باہر سیر کو نکلے۔ ایک مسجد میں گئے؛ جورجیا شہر کی مشہور جگہوں کی سیر کی۔ یہ محسوس کیا کہ یہاں کے مخدوش حالات جورجیا کے لوگوں کے حالات زندگی جیسے ہیں۔ ایک دو انڈین سکھ اور شاید چند پاکستانی نوجوان بھی نظر آئے۔ چونکہ ہم نے دو بجے ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہونا ہے اس لیے جلدی سو گئے۔

ہماری ٹیکسی آچکی تھی؛ ہم نے نیچے اُتر کر سامان رکھا اور ایئر پورٹ کی طرف

روانہ ہوئے۔ سڑکیں سنسان تھیں اس لیے جلد ہی ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ چیک اِن کروا کر کافی اور کراسنس سے تھوڑا سا ناشتہ کیا۔ ڈیپارچر لاوَنج میں بیٹھ گئے۔ عین وقت پر ہماری Aegean کی ایئر بس 320 ایتھنز کے لیے روانہ ہوئی ترکی کے اوپر گزرتی ہوئی استنبول سے Aegean سمندر سے گزر کر صبح ہونے سے اڑھائی گھنٹے پہلے ایتھنز اُتر گئی۔ ہم ٹرانزٹ مسافر تھے جنھیں ایتھنز سے استنبول کے بورڈنگ کارڈ Yerevan سے ہی مل چکے تھے اس لیے ہمیں صرف جہاز کو بورڈ کرنا تھا۔ ہماری فلائٹ ایتھنز سے اُڑی تو صبح ہو چکی تھی۔ میں نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو شہر کے گرد پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی جبکہ باقی شہر ابھی اندھیرے میں تھا۔ یہ منظر انوکھا تھا اور ہمیشہ یاد رہے گا۔

اب ہماری پرواز Aegean سمندر سے بالکل اُسی فلائٹ پاتھ پر واپس استنبول کی طرف جا رہی تھی۔ جب کہ چند گھنٹے قبل ہم دوسری طرف جا رہے تھے۔ ہماری فلائٹ استنبول کے نئے ایئر پورٹ پر اُتر کر ٹیکسی کر رہی تھی۔ یہ ہوائی اڈہ نہ صرف نیا ہے بلکہ کہتے ہیں کہ اب دنیا میں سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔ ہمارا جہاز لینڈ کرنے کے بعد پندرہ بیس منٹ ٹیکسی کرنے کے بعد رُکا اور ہم اُتر کر ایئر پورٹ داخل ہوئے۔ کافی کوشش کے بعد جب سامان نہ ملا تو Lost Luggage والوں سے رابطہ کیا۔ کچھ دیر بعد یہ بات واضح ہوئی کہ تقریباً 15 مسافروں کا سامان ایتھنز ہی رہ گیا ہے۔ ایئر لائن نے یقین دہانی کرائی کہ ہمارا سامان ہمارے گھر دس دن کے اندر پہنچ جائے گا۔ یہ بات ہمیں قبول نہ تھی کیوں کہ ہماری تمام ضروری اشیاء کپڑوں سمیت سوٹ کیسوں میں تھیں۔ ہم نے ابھی 10 ملکوں میں جانا ہے۔ نفیسہ سخت پریشان ہے۔ میری تسلّیوں سے اس کی پریشانی کم نہیں ہو رہی۔ اب فارم بھر کر ایئر پورٹ چھوڑ کر ہوٹل جانے کے سوا کوئی چارا نہ تھا۔ ہم واپس ہوٹل میں آ گئے۔

ایئر لائن کے ہیڈ آفس سے بات ہوئی۔ دو سخت قسم کی ای میل بھی بھیجیں اس

کے بعد کوشش بسیار کے باوجود انگلش میں فون نہ ہو سکا تو ہوٹل والوں نے فون کروایا تو بتایا گیا کہ مزید معلومات کل مل جائے گی۔ مجھے قونیہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر بھی جانا ہے اس لیے کل کی ریل کی ٹکٹ کی ناکامی پر بذریعہ ہوائی جہاز فلائٹ لی۔ اس کے بعد ہم ریسٹورنٹ کھانا کھانے چلے گئے۔ کھانے کے دوران اطلاع آئی کہ ایئر پورٹ والوں کا ہوٹل میں فون آیا ہے کہ سامان ایئر پورٹ پہنچ چکا ہے۔ وہ کوشش کریں گے کہ کل پہنچا دیں گے مگر ہم نے ٹیکسی پکڑی اور ایئر پورٹ سے سامان خود وصول کیا اور ہوٹل آ کر سو گئے۔

آج صبح 6:30 تیار ہو کر ٹیکسی میں بیٹھ کر صبیحہ گوچن ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے تو ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ سفر میں ایک گھنٹہ لگ سکتا ہے۔ ابھی 7 بجے تھے اور فلائٹ 8:45 بجے کی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے سفر 40 منٹ کا بتایا گیا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ٹریفک زیادہ ہے اور مجھے وقت پر پہنچانا اس کے لیے مشکل ہو گا۔ میں نے اسے کہا کوشش جاری رکھو اِن شاء اللہ بہتر ہو گا۔ اُس نے کہا کہ ٹریفک کی وجہ سے 150 لیرے سے کام نہیں چلے گا بلکہ 230 یا 250 لیرے ہو گا۔ میں نے کہا کہ چلتے جاؤ تمہیں 250 لیرے ملیں گے جو میں نے ادا کر دیے۔ خاصی دوڑ دھوپ کے بعد میں آخری مسافر اپنی فلائٹ میں بورڈ ہوا ہوں اور ہماری فلائٹ قونیہ کے لیے پرواز بھرنے والی تھی۔

قریب کی پہاڑیاں برف کی وجہ سے سفید نظر آ رہی ہیں بادل چھائے ہوئے ہیں۔ پائلٹ نے اناؤنس کیا ہے کہ درجہ حرارت 2- ہے۔ میں ایک جلیل القدر ہستی کے شہر میں پہنچ رہا ہوں اور اِن شاء اللہ آج کی نماز جمعہ یہاں ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمارا جہاز اب بادلوں سے گزر کر رَن وے کی طرف اُتر رہا ہے اور زمین پر خاصی دھند دکھائی دے رہی ہے۔ قونیہ نظر آ رہا ہے۔ یہ ایک بڑا اور ماڈرن شہر دکھائی دے رہا ہے۔ میری واپسی کا ٹکٹ کل کی تاریخ کا بنا ہوا ہے۔ یہ میں نے آج صبح نوٹس کیا

ہے اب اُتر کر سب سے پہلے تو جرمانہ دے کر آج شام کی فلائٹ بک کروائی۔ اب ٹیکسی لے کر شہر مولانا رومؒ روانہ ہوا۔ یہ نہایت ہی خوبصورت ماڈرن شہر ہے۔ ایک روشن صبح ہو رہی ہے۔ ڈرائیور نے گوگل ٹرانسلیٹر لگا کر مجھے پوچھا کہ کہاں سے ہیں؟ بتایا پاکستانی تو وہ خوش ہوا اور خوش آمدید کہا۔ میں نے صدر اردگان کا پوچھا تو کہنے لگا کہ وہ اچھا صدر ہے مگر کچھ ترکی کے لوگ اُسے پسند نہیں کرتے۔ عموماً ہر مسلمان لیڈر مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ بعض سازشی عناصر اُس کا کام مشکل کر رہے ہیں۔

مولانا رومیؒ کے حضور

میں یہاں مولانا رومؒ کے مزار پر پہنچ گیا اور ابھی ابھی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی ہے۔ میں نے مولانا رومؒ کے لیے فاتحہ پڑھی ہے سب کے لیے دُعا فرمائی ہے۔ یہ مسجد بادشاہ سلیم نے تعمیر کروائی ہے۔ ترکی مساجد کی طرح چھوٹے بڑے گنبدوں اور مینار پر مشتمل ہے جو نہایت خوبصورت ہے۔ ابھی جلد ہی مزار پر فاتحہ کے لیے جا رہا ہوں۔ خطیب اور نائب خطیب نے ابھی آ کر ہاتھ ملایا اور پوچھا کہ کہاں سے آیا ہوں اور خوش آمدید کہا۔

اب میں مختلف درویشوں کی قبروں پر فاتحہ کے بعد آگے بڑھ رہا ہوں اور مولانا کا مزار چند گز کے فاصلے پر موجود ہے۔ مزار کے بالکل باہر جید درویشوں کی قبور ہیں اور ساتھ ہی شاہی خاندان کے لوگوں کی قبریں بھی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا ایک مقام بھی بنایا گیا ہے۔ اب میں نے حسبِ ہدایت جوتوں پر نائلین کے موزے پہنے ہیں اور اندر جا رہا ہوں۔ کچھ تصاویر لی ہیں؛ اندر خاصی قبور ہیں جن میں نمایاں مولاناؒ کی ہے اور ساتھ ہی اُن کے بیٹے کی جنہوں نے یہ مزار بنوایا تھا۔ یاد رہے کہ یہاں پر سب سے پہلے مولاناؒ کے مرحوم والدؒ کی قبر تھی۔ مولانا کے والد کے مریدین نے خواہش ظاہر کی کہ اُن کے روضہ پر چھت ڈال کر مزار بنایا جائے۔ جس پر مولانا یہ کہتے ہوئے نہ

مانے کہ آسمان سے بہترین کوئی چھت نہیں۔ یہ مزار مولانا کے صاحب زادے محمد ولید نے مولانا کی وفات کے بعد تعمیر کروایا کیوں کہ مولانا کے والد سلطان العلماء بہاء الدین ولید کی قبرِ مبارک ہے۔ ان مزارات کے ساتھ بے شمار برکات ہیں جن میں مولانا کی ٹوپیاں، جبے، عثمانی اور سلجوقی دور کے کتابت شدہ قرآن کریم کے نسخے ہیں۔ بے شمار قرآنی نسخے ہیں اور ایک نسخہ بالکل چھوٹی سی ڈبیہ میں محفوظ ہے۔ ان کے علاوہ مولانا کی مثنوی (سلجوقی دور 1278 کی) بھی محفوظ ہے۔ ان سب نوادرات کے سنٹر میں ایک فانوس کے نیچے ایک چھوٹے سے چاندی کے صندوق میں بند حضور ﷺ کی داڑھی مبارک کا ایک بال موجود ہے۔ چھوٹا سا صندوق ایک شیشے کے ڈسپلے میں بند ہے۔ آپ صرف اس کے سامنے دُعا کر سکتے ہیں یا شیشے کے صندوق کو ہاتھ سے مَس یا بوسہ دے سکتے ہیں۔

حافظ شیرازیؒ کے دیوان کی کچھ نظموں والی 5 سو سال پرانی کتاب یہاں موجود ہے۔ مولانا جامی کی کتاب ''سحر الابرار جامی'' کا 5 سو سال پرانا نسخہ اور حدیقہ السعداء محمد فضل کی 1585 کی کتاب بھی موجود ہے۔ یہاں پر تقریباً دنیا کی ہر نسل انسانی کے لوگ موجود ہیں۔ جن میں ملائیشین، انڈونیشین، چینی، جاپانی، انڈین پاکستانی، بنگلا دیشی شامل ہیں۔ مڈل ایسٹ، افریقن مرد عورتوں کے علاوہ غیر مسلم سکالر جن میں یورپین اور امریکن بھی موجود ہیں۔ یاد رہے کہ مغربی غیر مسلم دنیا میں تصوف اور صوفی ازم میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی جو شہرت ہے وہ کسی اور شاعر، ولی اللہ اور صوفی کی نہیں۔ اس جگہ پر اس وقت اگر یہ کہوں کہ ایک روحانیت ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ بے شمار مرد اور بالخصوص عورتیں قرآن پاک پڑھ رہی ہیں۔ فاتحہ کہہ رہی ہیں دُعا مانگ رہی ہیں۔ ان جید ہستیوں کی قبور، نوادرات، قرآن پاک کے نسخے اور حضور ﷺ کے موئے مبارک کی برکتوں سے یہاں پر روحانیت کی کیفیت تو لازم ہے جو میں محسوس کر رہا ہوں۔ اب یہاں کمرے میں ایک بنچ پر بیٹھا اپنی کیفیات تحریر کر رہا

ہوں۔ ایک بوڑھی عورت پوچھ رہی ہے کہ میں کون سی زبان میں تحریر کر رہا ہوں؟ کچھ جاپانی لوگ کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہیں کہ میں کیسے تحریر کر رہا ہوں۔ وہ بہت حیران ہو رہے ہیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ مجھے بھی اُن کی طرح روانی میں لکھنا مشکل نظر آتا ہے۔ میں اُردو لکھ رہا تھا یعنی دائیں سے بائیں یہ اُن کے لیے انوکھی بات تھی۔

آج یہ لمحے ملے ہیں کہ میں مولانا کی قبر کے بالکل 50 گز کے فاصلے پر بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ میرے جدِ امجد میاں محمد بخشؒ کے کلام کو جس ہستی کے کلام سے اکثر تشبیہ دی جاتی ہے۔ آج اُن کی قبر کے پاس ایک طرح کی اپنائیت کا بھی احساس ہو رہا ہے۔ کتابیں اور تصانیف مصنّف کے چلے جانے کے بعد اُس کا ورثہ اس دنیا میں رہ جاتا ہے جس سے آئندہ نسلیں استفادہ کرتی ہیں۔ مصنّف کے مقام کو سمجھتی ہیں اور اُس کی تحریروں کو مقدم جانتی ہیں۔ مصنّف کبھی بھی نہیں مرتا جب تک اُس کی تصانیف موجود ہوں اور پڑھی جا رہی ہوں۔ اس لیے تصانیف کی حفاظت انتہائی ضروری ہے۔ بالخصوص یہ بھی دھیان رکھنا انتہائی لازمی ہے کہ کوئی خود غرض شخصیت چاہے وہ مصنّف کی فیملی کا ہو یا کوئی صاحبِ اقتدار ہستی تصانیف یا مصنّف کی شخصیت یا شجرہ نسب میں کمی بیشی نہ کرے۔ یہ میں آج یہاں بیٹھے ہوئے محسوس کر رہا ہوں کہ یہ کام کرنا کتنا ضروری ہو گیا ہے۔ میرا یہاں سے اُٹھنا ضروری ہو گیا ہے۔

مولانا کے والد مرحوم کے ساتھ سلطان العلماء کا لفظ لکھا پڑھا تو یہ حقیقت نظر آئی۔ جبکہ آج کل ہر دوسرا مولوی یا امام علامہ اور مفتی کہلواتا ہے۔ ولی اللہ کے خاندان کے اکثر لوگ پیر اور پتہ نہیں کیا کیا کہلواتے ہیں۔ میرا مقصد تنقید سے زیادہ اصلاح ہے کہ براہِ مہربانی ان القابات کو اتنا سستا مت کریں کہ آئندہ نسلیں جب سلطان العلماء پڑھیں تو اُن ہستیوں کو چودھویں صدی کے معمولی عالم ہی سمجھیں۔ اب میں بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن چکا ہوں۔ بہت لوگ تجسّس سے کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ میں کیا تحریر کر رہا ہوں۔

اب میں مزار کے باہر فوارے کے سامنے ہوں۔ لوگ خوشی خوشی اندر جا رہے ہیں اور اندر سے باہر آجانے والے نائیلون کے موزے اُتار رہے ہیں۔ بہترین دھوپ نکلی ہوئی ہے اور میں مزے سے باہر بیٹھ کر ایک بار پھر ڈائری تحریر کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی مسجد سلیم سے اذانِ عصر شروع ہو چکی ہے اس لیے اب ان شاء اللہ نماز کے لیے جاؤں گا۔ ابھی ابھی ایک نہایت ہی حلیم بوڑھی خاتون آئی اور بہترین رحیمانہ مسکراہٹ دے کر میری آنکھوں میں دیکھا اور مجھے میری والدہ ماجدہ کی یاد دلائی۔ میں اسی لمحے کو دل میں جگہ دے رہا تھا کہ انہوں نے دو سنگتریاں میری ہتھیلی پر رکھیں اور چل پڑیں۔ اسی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ میں اُن کو جاتے دیکھتا رہا اور وہ ساتھ نماز والے کمرے میں داخل ہو گئیں اور میرا خوبصورت لمحہ بہت جلدی گزر گیا۔ میں نے نمازِ عصر کے بعد مولاناؒ سے رخصت لے کر ترکش کافی کا کپ پیا اور کتابیں خریدنے کے بعد بذریعہ ٹیکسی ایئرپورٹ آ گیا ہوں۔ ابھی کافی وقت ہے۔ اس لیے ڈیپارچر لاؤنج میں پُرسکون بیٹھا کتاب پڑھنے لگا ہوں۔ آج قونیہ آکر وقت بہت اچھا پُرسکون اور روحانیت سے بھرپور گزار کر 8:30 کی فلائٹ سے واپس استنبول جاؤں گا۔ اِن شاء اللہ!

ارطغرل کی سرزمین پر

آج استنبول کی ایک خوبصورت صبح ہے اور ہم ہوٹل سے چلتے ہوئے استقلال سٹریٹ پر پہنچ گئے ہیں۔ اب ہمارا رُخ نیچے کی طرف ہے اور ہم ایک بلڈنگ کے پاس سے گزرے تو اشتہار دیکھا درویشوں کی مخصوص والہانہ مولانا رومؒ کی طرز کی محفلِ سماع اتوار کو ہوگی اور ہم اِن شاء اللہ دیکھنے آئیں گے۔ اس سے آگے بڑھے تو Galata ٹاور نظر آیا وہاں سے رات کو استنبول کا بہترین نظارہ ہوتا ہے۔ مشکل سے سیڑھیاں اُترتے ہوئے Marmaris کے پُل پر پہنچ گئے جہاں پر بے شمار لوگ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ خوبصورت جہاز ٹورسٹوں کو سمندر میں سیر کرا رہے ہیں۔ پُل سے گزرتے ہوئے ہمیں ایک پُل دائیں نظر آیا اور ایک بائیں نظر آرہا ہے۔ دونوں سے لوگ اور ٹریفک گزر رہی ہے۔ اچانک پُل نے تھرتھرانا شروع کر دیا اور پُل واضح طور پر تھرتھرا رہا تھا۔ ایک ٹرام ابھی ہمارے پاس سے گزر گئی تو تھرتھراہٹ بھی ختم ہوگئی اس کے بعد جب بھی کوئی بڑی گاڑی گزرتی تو تھرتھراہٹ محسوس ہوتی۔

ہم اب استنبول کے اشیاء کی خرید وفروخت والے حصّے میں آگئے اور یہاں پر ایک بہت بڑا بازار گرم ہے جہاں پر خشک میوہ جات؛ ترکش ڈیلائٹ اور انواع و اقسام کی مٹھائیاں بِک رہی ہیں۔ ساتھ ہی مصالحہ جات کے بازار میں داخل ہوئے تو مصالحوں

کی خوشبوؤں اور اقسام سے حیرت زدہ ہوئے۔ چائے اور کافی کی مختلف قسموں سے دُکانیں بھری پڑی تھیں۔ ساتھ ہی مصری بازار ہے جہاں پر عربی اشیاء اور لکڑی سے بنی اشیاء کی بھرمار تھی۔ مجھے شاپنگ سے دلچسپی نہیں تھی۔ ہم جلدی نکل کر سمندر کنارے ایک کیفے میں بیٹھ کر تھوڑی ریفریشمنٹ کرنے اور سمندر کے کنارے سلطان احمد مسجد یا مسجد نیلی مسجد کی طرف چلتے ہوئے وہاں پر پہنچ گئے۔ وضو کرنے کے بعد مسجد میں داخل ہوا ہوں اور یہاں پر مسجد میں تزئین نو کا کافی وسیع کام چل رہا ہے۔ مسجد کے صحن، دیواروں کے اندر اسلام اور مسجد کی معلومات لکھی ہوئی ہے۔

مسجد کی وسعت، طرزِ تعمیر اور آرائش قابلِ دید ہے۔ نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد باہر آکر چند لمحے تعمیر اور اس خوبصورت جگہ کے انتخاب کی داد میں گزارے۔ مسجد کے اندر حضرت بلال حبشیؓ کا مقام بھی ہے۔ دوسری مسجد ہاگیا صوفیہ پہلے عیسائیوں کا ایک نہایت ہی متبرک مقام تھا۔ جس میں ابھی تک عیسائیوں کی نشانیاں موجود بھی ہیں اور یہاں پر نماز نہیں پڑھی جاتی (اب الحمدللہ 2020ء میں یہاں نماز باجماعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔) اُس کا رُخ کیا اور ٹکٹ خرید کر اندر داخل ہوئے۔ عمارت نہایت عالی شان ہے اسے مسجد میں بھی تبدیل کسی حد تک کیا گیا ہے۔ اس کے صحن میں شہزادوں اور بادشاہوں کے مقبرے بھی ہیں۔ باہر کے احاطے میں عثمانی بادشاہوں کے حرم اور کنیزوں کی رہائش گاہیں تھیں۔

یہ وہ عیسائیوں کی متبرک جگہ تھی جسے مسلمانوں کو قبضے میں دینے کے بعد پوپ نے اُندلس کے مسلمانوں کے خلاف تمام عیسائیوں کو جنگ کا حکم دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے نہ صرف قرطبہ، غرناطہ، اشکیبہ کی جامع مساجد اور الحمرا محل کھو دیا بلکہ سپین اور پُرتگال سے مسلمانوں کی حکومتیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں۔ مسلمانوں کو شہید کر کے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ اس وقت کے مسلمانوں بالخصوص غرناطہ کے حکمرانوں کے عیسائیوں سے مذاکرات میں بے بسی آج کے مسلمان حکمرانوں

کے حالات سے مماثلت رکھتی ہے۔ نہ جانے کیوں مسجدِ قرطبہ کا دُکھ زیادہ محسوس ہوا۔ بے شک مسجد ہا گیا صوفیہ ایک بڑی اہم اور بڑی بلڈنگ ہے مگر مسجدِ قرطبہ کی وسعت کے علاوہ اُس کے درمیان میں کلیسا کو دیکھ کر جو دُکھ پہنچا تھا اُس کا ذرا بھی مداوا یہاں منبر دیکھ کر نہیں ہوا۔ بہر حال یہ تاریخ کا پھیر ہے۔

اب بذریعہ ٹیکسی ہوٹل جائیں گے کیونکہ آج بھی کافی پیدل سفر کرنے سے گھٹنے اور ٹخنے درد کر رہے ہیں۔ نزدیکی ریسٹورنٹ سے کھانا کھانے کے بعد اب آرام سے سو گئے۔

آج سب سے پہلے صحابیِ رسول ﷺ ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر حاضری کا شرف حاصل کیا اور نمازِ ظہر وہیں ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ یہاں پر حضور نبی پاک ﷺ کے ہاتھ سے لگائے گئے درخت کا پتہ محفوظ ہے اور ساتھ ہی داڑھی مبارک کے بال شریف شیشے کی سپیشل ڈسپلے میں محفوظ ہیں۔ آج اس جگہ کی حاضری کا شرف حاصل ہوا اور سکون محسوس کیا ہے۔ اب میں Topkapi میوزیم اور پیلس میں آ گیا ہوں اور یہاں پر بہت ہی رش ہے۔ یہ عثمانی بادشاہوں کا محل ہے۔ نہایت ہی وسیع و عریض احاطے پر مشتمل ہے جس میں بادشاہوں کے زیرِ استعمال دیوان، خزانہ، مسجد، بغداد Kiosk اور Yerevan کی Kiosk بھی شامل ہیں۔ یہاں پر اور قابلِ دید میوزیم میں رکھے گئے بے شمار تبرکات حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے علاوہ باقی پیغمبروں کی اشیاء سامان حرب گھڑیاں، بادشاہ، ملکہ اور بقیہ خاندان کے علاوہ کنیزوں کی رہائش گاہیں بھی شامل ہیں۔ ایک پورا سیکشن صرف کچن اور برتنوں پر مشتمل ہے۔ یہ محل بادشاہ محمد فاتح نے استنبول کی فتح کے بعد بنانے کا حکم دیا اور یہ 1460-1478 میں تعمیر کیا گیا۔ یہ عثمانی بادشاہوں کا گھر تھا انیسویں صدی تک۔ بادشاہوں کی رہائش بدل جانے کے باوجود بھی اس کی اہمیت اس میں بابرکت نوادرات کی وجہ سے کم نہ ہوئی۔ ساتھ ہی خزانہ بھی یہاں رہا اور نظامِ حکومت کے دفاتر بھی۔ جاں نثاری کے لیے دشمن کے بچے بطور

ٹیکس لیے جاتے تھے جنھیں تعلیم وتربیت دی جاتی تھی اورفوج میں خاص مقام دیا جاتا تھا۔

محل کے دوسری طرف سمندر کا نظارہ ہے اور بازنطینی دور کی پرانی دفاعی دیواریں ہیں۔ اس کے علاوہ ختنہ کرنے کے لیے ایک عالی شان کمرہ ہے۔ اس کے علاوہ بادشاہ احمد سوئم کی لائبریری بھی ہے۔ دیوان ہمایوں ایک خاص حصّہ ہے جہاں پر عوام الناس کے خاص مسائل کے علاوہ حکومتی کام اور خزانہ کے امور زیرِ بحث آیا کرتے تھے۔ سلطان ایک کھڑکی سے یہ معاملات دیکھا کرتے تھے۔ خود حصّہ نہیں لیتے تھے اور اگر کوئی وزیر غلط فیصلہ کرتا تو بادشاہ کھڑکی بند کر دیتا۔ کارروائی معطّل ہو جاتی اور وزیر بادشاہ کے سامنے جا کر حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرتا۔ عثمانی بادشاہ اس طرح عدل کا خاص خیال رکھتے تھے۔

شام کو ہم نے Galata ٹاور کے عین سامنے والے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور پھر ٹاور پر جا کر استنبول کا نظارہ لیا۔ استنبول رات کو بھی نہایت خوبصورت لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے مولانا رومؒ کی شروع کردہ روایت جس میں درویش سماعی محفل میں ایک مخصوص انداز میں وجد میں گھومتے ہیں۔ وہ پرفارمنس بھی دیکھی میں نے لفظ پرفارمنس اس لیے استعمال کیا ہے کیونکہ مجھے دیکھنے میں کسی قسم کی روحانیت محسوس نہ ہوئی۔ ہال شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں کم از کم پچانوے فیصد غیر مسلم تھے کیمرے اور فون سے تصاویر یں لی جارہی تھیں۔ اُن کے لیے یہ ایک گریس فُل ڈانس ہی تھا۔ ایسے ماحول میں روحانیت کا گزر کم ہی ہوتا ہے میرے ساتھ ایسے ہی ہوا ہے۔

آج کا دن آرام کا ہے اور صرف ترکش حمام میں نہانے کے علاوہ کوئی خاص پروگرام نہیں۔ استقلال اسکوائر کی سیر کی ہے اور سامان وغیرہ کو اکھٹا کر کے ایک بوفے ریسٹورنٹ سے مزے دار کھانا کھایا ہے۔ ہوٹل کے عملے نے ہماری بہت مدد کی اور ہم نے اپنی Budapest کی فلائٹ ٹکٹ وغیرہ پرنٹ کر لیے ہیں۔ اپنے سفر کی تیسری Stage کی پوری تفصیل مکمّل کر لی ہے۔ اب اِن شاء اللہ صبح سویرے ناشتے کے بعد

ہم بذریعہ ٹیکسی استنبول کے نئے ہوائی اڈے جائیں گے وہاں سے ہماری فلائٹ استنبول سے ہنگری کے دارالحکومت کے لیے پرواز بھرے گی۔ ہمارا یورپ کا سفر شروع ہو جائے گا۔

ہماری ترکش ایئر ویز کی فلائٹ بوئنگ 737 کے طیارے میں Budapest کے لیے استنبول کے نئے ہوائی اڈے سے اُڑی ہے۔ایک خوبصورت دن ہے اس وقت 12:35 کا وقت ہے۔ سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے اور ہم ریڈ سی سے اوپر پرواز کر رہے ہیں۔ آج ہمیں استنبول چھوڑنے کا تھوڑا دُکھ بھی ہوا اور ساتھ ہی اگلے دو ہفتے چونکہ ہم نے یورپ کے ملکوں میں گزارنے ہیں۔ وہاں حلال کھانا بھی کافی کوشش سے شاید ملے گا۔ سبزی یا مچھلی پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔ بہرحال استنبول کی خوبصورت یادیں لے کر ہم یورپ میں داخل ہورہے ہیں جو ایک Milestone ہے۔ ہم نے اب براعظم ایشیاء کو بھی خداحافظ کہہ دیا ہے اور جس براعظم میں ہمارا گھر ہے اُس میں داخل ہورہے ہیں۔ اب جہاز سمندر کی بجائے خشکی پر اُڑ رہا ہے۔ نیچے پہاڑیاں نظر آرہی ہیں۔ کچھ پہاڑوں کی چوٹیاں سفید برف کی وجہ سے نظر آرہی ہیں۔ ہمارا جہاز بروقت Budapest کے ہوائی اڈے پر اُتر آیا ہے۔ ہم ایئرپورٹ سے اپنا سامان لے کر سپیشل بس میں بیٹھ گئے ہیں جس نے ہمیں شہر کے وسط میں اُتار دیا ہے۔ ہم تھوڑی دور ہی سامان لے کر اپنے ہوٹل میں پہنچ گئے ہیں اور ابھی دن کا تقریباً تیسرا حصہ باقی ہے کیونکہ وقت کی تفاوت کی وجہ سے ہم جس مقامی وقت کے مطابق اُڑے تھے یہاں بھی اُسی مقامی وقت کے مطابق پہنچ چکے ہیں۔

ہم نے باہر نکل کر مشہور پُل جو دریائے ڈائنوب پر واقع ہے کی سیر کی۔ مقامی حلال ترکش ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ میں یہ سوچ کر کبھی حیران کبھی پریشان ہوا کہ عثمانیہ دورِ حکومت میں 1699ء تک مکر شان (موجودہ ہنگری) سلطنت کا حصّہ تھا اور 1699ء کے بعد مسلمانوں کی حکومت یہاں پر ختم ہوگئی۔

یادِ ماضی عذاب ہے

ہم سب سے پہلے سینٹ سٹیون گرجا گھر جو عیسائیوں کی بہت بڑی اور مشہور مذہبی عمارت میں گئے ساتھ ہی یہودیوں کا (Synagogue) مذہبی عمارت ہے یعنی چرچ کہہ لیں وہ دیکھی۔ اس کے بعد ڈائینوب کے کنارے مردوں،عورتوں اور بچوں کے پرانے جوتے ہیں۔ جن کے متعلّق مشہور ہے کہ نازیوں نے انھیں یہاں گولی مار کر دریا میں پھینک دیا تھا۔ جوتے اتروانے کی وجہ جوتوں کی قیمت اچھی بتائی جاتی ہے تو اگر جوتے قیمتی تھے اور ان بیچاروں کو مارنے سے پہلے جوتے کھونے پڑے تھے تو یقیناً وہ قیمتی جوتے تو اُس وقت نازیوں نے لے لیے ہوں گے ورنہ اُتروانے کی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ یقیناً کوئی اور جوتے اُن کے نعم البدل کے طور پر رکھ دیے ہوں گے۔ صرف مذہبی یا نسلی وجہ سے بے گناہ لوگوں کو مارنا بہت بہیمانہ قدم تھا اور اس کی ہر صورت مذمت لازمی ہے۔

ہم نے ہنگری کی پارلیمنٹ دیکھی جو کہ ایک Gothic طرزِ تعمیر کی خوبصورت عمارت ہے اور جو برٹش پارلیمنٹ کی عمارت سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس کے بعد ہم ایک پل سے دریائے ڈائنوب کے دوسری طرف گئے اور راستے میں جزیرہ مارگریٹ ہے۔ یہ جزیرہ دریا کے درمیان ہے اور تقریباً ایک میل کے قریب لمبا ہے۔.دوسری

جانب پہنچ کر ایک چھوٹے سے کیفے میں کافی پی اور ایک گھنٹہ بیٹھ کر آرام کیا۔ Fisherman's Bastian گئے یہ ایک اونچی جگہ پر خوبصورت مذہبی چرچ قسم کی عمارت ہے۔ یہاں پر ایک مجسّمہ ہے جو ان کے Saint کا ہے کیونکہ اس کے سر کے اوپر بھی فرشتوں والا رنگ بنا ہوا ہے جو Saint ہونے کی نشانی تصور کی جاتی ہے۔

نفیسہ نے ایک لائن میں کھڑے ہو کر ہنگری کی سب سے پرانی بیکری سے کچھ چاکلیٹ اور پیسٹری خریدی۔ ہم نیشنل میوزیم اور اُس کے BUD قلعہ گئے جو شاہی خاندان کا نہ صرف قلعہ رہا ہے بلکہ تخت اور رہائش گاہ بھی رہی ہے۔ اسی محل نما قلعہ بلڈنگ میں کراشش پاشا 1600 کا ٹاور بھی ہے جو قلعے کی حفاظت کے کام بھی آتا رہا ہے۔ اس قلعے کا اُونچے مقام پر واقع ہونا نہ صرف خوبصورتی میں اضافہ کرتا رہا ہے بلکہ یہ ایک دفاعی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔ آج بھی BUD Castle سے شہر کا بہت اچھا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم 15000 سے اوپر قدم چل کر تھک چکے ہیں۔ میں نے یہاں کے مشہور کھولتے ہوئے گندھک کے پانی کے چشمے پر بنے حمام کا رُخ کیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ سلفر گندھک کی آمیزش شدہ گرم پانی کے جو چشمے زمین سے نکلتے ہیں اُن پر چلنے والے اس Thermal Bath میں گزارہ اور اور جسم کو قدرے آرام آیا۔ اب ہم نے چین برج سے ڈائنوب عبور کرتے ہوئے اس شہر کے تقریباً تمام مشہور مقامات کی سیر کر لی ہے۔ شامی ریسٹورنٹ میں نہایت لذیز کھانا کھا رہے ہیں۔ میری پیاری بہو صلاف اویس شامی عرب ہے اس لیے ہمیں ان کھانوں کا کافی تجربہ ہے۔ آج مزے سے کھانا کھا کر ہوٹل آچکے ہیں اور صبح اگلے سفر کے لیے سامان باندھیں گے۔

آج ہم بڈا اور پیسٹ دونوں کو چھوڑ رہے ہیں۔ یاد رہے کہ دونوں شہر علیحدہ علیحدہ شہر تھے جو ڈینیوب دریا کے مختلف کناروں پر آباد تھے۔ ان دونوں کو ملا کر نیا شہر Budapest بنا جو کہ آسٹرو ہنگری بادشاہت کا ایک نہایت اہم شہر تھا۔ آسٹرو ہنگرین سلطنت دو شاہی خاندانوں یعنی ہنگری اور آسٹریا کی مشترکہ ایک بہت

بڑی سلطنت تھی۔ 1914ء میں آرچ ڈیوک کو سربین نیشنلسٹ نے Sarajevo میں قتل کیا تھا۔وہی پہلی جنگِ عظیم کا بہانہ بنا۔ 1918ء میں جنگ کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ اسٹروہنگریان ایمپائر بھی ختم ہوگئی۔

ہماری کوچ نہایت اچھی اور تمام تر سہولیات سے مزین تھی مثلاً ٹائلٹ، وائی فائی، چارج پوائنٹ کے علاوہ فری چائے کافی وغیرہ۔ہم عین وقت پر ہی کوچ پر پہنچے تھے حالانکہ ہم نے 45 منٹ اضافی رکھے ہوئے تھے۔ ہمارا ٹیکسی ڈرائیور ہمیں غلط بس اڈے پر اُتار گیا تھا جو شہر کا مین اڈا تھا مگر ہماری بس International تھی جس نے ہنگری، آسٹریااور چیکوسلوا کیہ جانا تھا۔سو یہ اُس کا سٹاپ نہ تھا۔ بہرحال ہم معلومات لے کر عین وقت پر بس میں سوار ہو گئے۔ سامان وغیرہ نیچے رکھا گیا اور ہوائی جہاز کی طرح کے سٹکر ہمارے سامان کو لگائے گئے تھے۔ بس میں تقریباً ہوائی جہاز کی طرح کی سیٹیں ہیں۔ چائے،کافی اور پانی دیا جا رہا ہے جبکہ چاکلیٹ، سینڈوِچ وغیرہ خریدے جا سکتے ہیں۔ بارش اب بھی جاری ہے اور ہماری بس اب بڈاپیسٹ سے نکل کر اب براٹا سلوا (Bratislava) کی طرف ہائی وے پر خاصی سپیڈ سے جا رہی ہے۔ ڈرائیور کے علاوہ جو سیٹورڈ بھی بس کے عملے میں شامل ہے وہ اچھی انگریزی بول کر بھی لوگوں کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔

اب ہم شہر سے باہر آچکے ہیں اور زرعی زمین سڑک کے دائیں بائیں ہیں جس میں کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ یہ نہایت ہی زرخیز کالی مٹی والی زمین ہے۔ ہماری پچھلے سیٹ پر ایک مرد اور عورت کی آواز انڈین انگریزی لہجے میں آرہی تھی۔ اب اُردو میں مرد فون پر باتیں کر رہا ہے اور کسی کو بتا رہا ہے کہ اب بڈاپیسٹ سے پیراگ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ کچھ دیر بعد اُس کی ماں کا فون آجاتا ہے اور وہ ماں کو اپنی خیریت کی اطلاع دیتا ہے۔ساس اور بہو کے درمیان بھی دوچار جملوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔اب مرد گانے کی کوشش کرتا ہے اور آپس میں دونوں میاں بیوی زور سے گپ شپ

لگا رہے ہیں۔ نفیسہ اپنی سیٹ پر سو چکی ہے۔ اب اِن شاء اللہ ہم یورپ میں اچھی ٹرانسپورٹ کی سہولیات کی وجہ سے آسان سفر کریں گے۔ نفیسہ جاگ گئی ہے اور اپنی امی کو پنجابی میں میسج کر رہی ہے کہ اب سلواکیہ جا رہے ہیں اور آسٹریا جائیں گے وغیرہ۔ میں نے محسوس کیا کہ ہماری پیچھے والی سیٹ سے بات چیت بند ہو گئی ہے۔ ہم اُن کے آگے بیٹھے تھے اور اُنہوں نے ہمارا برٹش انگریزی کا لہجہ سن کر ہمیں بھی یورپین ہی سمجھا ہو گا کیونکہ نہ انہوں نے ہمیں دیکھا تھا اور نہ ہم نے اُنھیں۔ مجھے اُن پر ترس بھی آیا کہ وہ شرمساری محسوس کر رہے ہوں گے۔

بہرحال ہماری بس عین وقت پر ہمیں براٹا سلوا لے آئی ہم نے اُتر کر اپنا سامان رکھا اور شہر کی سیر کو چل پڑے۔ یہاں کا مشہور نیلا چرچ (Blue Church) دیکھا۔ پرانے شہر میں گئے اور ایک کیفے میں بہت اچھی پودینے کی چائے مع لیموں اور شہد کے پی اور ساتھ ہی پنیر کیک کھایا۔ مشہور UFO ٹاور دیکھا جو ایک پل پر 100 میٹر اُونچا گولائی میں بنایا گیا تھا۔ طرز کا بنایا گیا ہے اور صاف موسم میں کہتے ہیں پچاس، ساٹھ میل دور تک دیکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ آج بارش اور دھند ہے اس لیے ہم اوپر نہ گئے۔ اب ہم نے اضافی پیسے دے کر اپنا ویانا کا ٹکٹ آگے کرا لیا ہے اور یہاں سے چار گھنٹے پہلے نکل جائیں گے۔ ہماری کوچ پورے 2 بجے ویانا ایئر پورٹ اور ویانا شہر کے لیے نکل پڑی۔ راستے میں دو جگہ سے مزید مسافر اُٹھائے پہلے ایئر پورٹ رُکی اور اس کے بعد ویانا کے مین سٹاپ Haptabonhauf پر آ کر رُکی۔ ہم اُترے سامان ٹیکسی میں رکھا اور اب اپنے فلیٹ پہنچ گئے ہیں جس کی چابیاں عمارت کے باہر رکھے ایک ڈبے میں کوڈ ڈال کر (جو نفیسہ کے فون پر بھیجا گیا تھا۔) نکالیں۔ ہم فلیٹ کے اندر آ چکے ہیں۔ یہ دو ڈبل بیڈروم کچن اور باتھ روم پر مشتمل وسیع فلیٹ ہے۔

مجھے ویانا ایئر پورٹ سے نکل کر شہر کی طرف جانے والے راستے میں متعدد دھواں دار چمنیاں دکھائی دیں جو بہت زیادہ آلودگی پھیلا رہی تھیں۔ میں حیران ہوں

کہ مغربی دنیا کے ایک ملک کے دارالحکومت کے پاس سے اتنا زیادہ دھواں ماحول کو آلودہ کر رہا ہے ایسا ہم نے چین میں بھی دیکھا تھا۔ یہ اُس سے کسی طرح کم نہ تھا۔ شام کو ہم نے ویانا میں ایک بار پھر عرب شامی ریسٹورنٹ میں ہی کھانا کھایا اور مقامی سپُر مارکیٹ سے صبح کے ناشتے کا سامان خرید لیا جو صبح کے ناشتے کے کام آیا۔

آج 13 دسمبر UK میں الیکشن کے نتائج آنے شروع ہو گئے ہیں۔ پولز بتا رہے تھے کہ بورس جانسن کی دائیں بازو کی متعصّب پارٹی نے یہ الیکشن جیت لیا۔

ہم نے Hop on Hop off بس کا ٹکٹ خریدا ویانا کی سیر کے لیے۔ ویانا میں قابلِ ذکر چیزوں میں سے سٹیٹ اوپرا ہے۔ سٹی ہال نیشنل تھیٹر، ویانا یونیورسٹی جو نئی ہے لیکن پہلی ویانا یونیورسٹی دنیا کی قدیم ترین جرمن یونیورسٹی تھی جو چودھویں صدی میں شروع کی گئی تھی۔ سگمنڈ فرائیڈ کا گھر جواب میوزیم ہے اور قریب ہی اُس Psyco Anaylist کے نام پر پارک بھی ہے۔ اس کے علاوہ میوزیم آف کرائم بھی ہے جس میں ایک شخص کے جرم کی داستان بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ صاحب فوج میں ملازم تھے اور اپنے سینئر آفیسر کو زہر دے کر مار دیتے تھے تاکہ پروموشن مل سکے۔ اس طرح ترقی کرتے کرتے جرنیل بننا چاہتے تھے مگر پکڑ لیے گئے اور 20 سال کے لیے جیل جانا پڑا۔ ویانا چونکہ دریائے ڈینیوب کے کنارے پر ہے اور طغیانی کی وجہ سے خاصا نقصان ہوتا تھا اس لیے دریا کا رُخ موڑا گیا۔ انیسویں صدی میں نہر سویز کھودنے والی استعمال شدہ مشینوں کو استعمال کر کے۔ یہاں بذریعہ دریا آپ براٹا سلوا بھی جا سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں شہروں کے درمیان صرف 62 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ یورپ میں دو دارالحکومتوں میں یہ سب سے کم فاصلہ ہے۔ یہ شہر موسیقاروں کا شہر ہے یہاں پر Beethown، Brahms، Berg، Braun، Strauss اور Haydn قابلِ ذکر ہیں۔

سامان حرب کا بھی میوزیم ہے جس میں عثمانیہ دور کے 1683ء کے محاصرے

کی باقیات بھی موجود ہیں۔ 1699 میں Holy Roman بادشاہت Hansburgاور پولش Lithuanian کامن ویلتھ نے مل کر عثمانیہ فوج کو شکست دی اور ویانا کا محاصرہ ختم ہوا۔اس محاصرے کی نشانیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ ایک بہت بڑا ٹاور بھی ہے جہاں سے آپ شہر کا نظارہ لے سکتے ہیں اور کیفے میں کافی کیک بھی کھا سکتے ہیں۔ Belvedere محل بھی ہے اور آرچ ڈیوک بھی یہیں مقیم تھا جس کا سریووا میں قتل سربین انتہا پسند نے کیا تو پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ بڈا پیسٹ کی طرح یہاں بھی دریائے ڈینیوب میں ایک جزیرہ ہے۔ اس کے علاوہ قابلِ ذکر اقوام متحدہ کی بلڈنگ ہے۔ کیونکہ دنیا میں یہ نیویارک جنیوا کے بعد تیسرا شہر ہے جہاں پر UNOکے دفاتر ہیں۔ یہ دفتر بالخصوص ایٹمی توانائی کے پھیلاؤ، کنٹرول اور ایٹمی طاقت کو مانیٹر کرنے کا خاص فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہاں کی زبان جرمن ہے اور یاد رہے کہ ہٹلر کا 31-Stumper Grasseوالا گھر بھی موجود ہے۔ آج کل جس فلیٹ میں ہمارا دو دن کا قیام ہے۔وہاں پر باہر کے لوگوں کی خاصی تعداد بستی ہے اور اُن میں اکثریت عرب مسلمانوں کی ہے۔ پاکستانی بھی ہیں اس وجہ سے ہمیں حلال کھانا ڈھونڈنے میں بالکل کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

نفیسہ نے خود ناشتہ بنایا۔ ہم نے کھانے کے بعد اپنا سامان پیک کیا اور فلیٹ کو چھوڑ کر ریلوے سٹیشن پہنچ کر کافی دیر وہیں وقت گزارا کیونکہ ہماری ٹرین 2:45 کی تھی۔ کافی ہاؤس میں کافی پی کر بالآخر اپنی ٹرین پر سوار ہو گئے۔ ہم ویانا چھوڑ رہے تھے۔ ایک بار پھر دریائے ڈینیوب کے اوپر سے گزرے۔ یہ ہمارا دریا کا آخری دیدار ہو گا۔ ہماری ٹرین کی درمیانی درجے کی کلاس تھی جو کہ نہایت ہی آرام دہ سیٹوں پر مشتمل تھی۔ پینے کی گرم یا ٹھنڈی اشیاء بھی شامل تھیں۔ غالباً ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ گزرا تو ہم چیکوسلواکیہ میں داخل ہو گئے۔ جب سے ہم ترکی سے آئے ہیں ہمیں کسی بھی یورپین یونین کے ملک کو چھوڑتے یا داخل ہوتے پاسپورٹ نکالنے کی ضرورت نہیں

پڑی۔ اب جا کر برطانیہ اگلے مہینے کے آخر میں یورپی یونین کا ممبر نہیں رہے گا۔ ہماری یہ سہولت جاتی رہے گی۔ ہماری ٹرین پونے سات بجے شام عین وقت پر پراگ پہنچ گئی اور پلیٹ فارم سے ہی ایک آدمی نے ٹیکسی کی آفر کی 20 یورو میں جو کہ شاید دوگنی قیمت تھی مگر وہ دونوں سوٹ کیس لے کر بھی جا رہا تھا۔ میں نے نفیسہ کو کہا کہ قلی اور ٹیکسی دونوں کا 20 یورو مہنگا نہیں کیونکہ سامان کو گھسیٹنا اب مجھے مشکل لگ رہا تھا۔ ہم اپنے فلیٹ میں آ گئے ہیں اور ابھی کھانا کھانے کے بعد آرام کا ارادہ ہے کیونکہ کل پراگ کا شہر ہمارا انتظار کر رہا ہے اور بارش کی بھی پیشین گوئی ہوئی ہے۔

آج ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے اس لیے ہم نے ناشتے کے بعد دو گھنٹے انتظار کیا اور اب پراگ کی سیر کو نکلے ہیں۔ آج کی اتوار کرسمس کی تیسری Advent ہے اس لیے سڑکوں پر بہت رش ہے۔ سنٹرل پراگ پیدل چلنے والوں کے لیے ہے اس لیے ٹریفک نہیں ہے سوائے ایک آدھ کار کے۔ بگھیوں سے سیاح جا رہے ہیں۔ خوبصورت اور طاقتور گھوڑوں کی جوڑیاں ان بگھیوں کو کھینچ کر لے جا رہی ہیں۔ کوچوان نہایت مستعدی سے آگے بیٹھے اُن کو ہانک رہے ہیں۔

اب ہم St.George کے پُل سے گزر رہے ہیں۔ یہاں نہ صرف بہت رش ہے بلکہ ہر دس پندرہ گز کے فاصلے پر پُل کے دونوں جانب بڑے بڑے مجسّمے بنائے گئے ہیں جن پر بہت محنت کی گئی ہے۔ یہ مجسّمے نقلی ہیں کیونکہ اصلی مجسّمے تو پراگ کے میوزیم میں ہیں۔ یہ اُن کی ہو بہو نقل بنا کر پُل پر رکھے گئے ہیں۔ ان کو یہاں بہت عرصہ ہو گیا اور یہ اب تقریباً سب کے سب موسم کی وجہ اور گرد و غبار کی وجہ سے کالے ہو گئے ہیں۔ پُل کے آخر میں ہمیں نظر آیا کہ اب ان کو صاف کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔ دو تین مجسّمے تو اب تقریباً نئے لگ رہے ہیں۔ یہ سب کے سب مذہبی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں صلیبی، پوپ، بشپ اور پادری وغیرہ نظر آتے ہیں۔

پُل کے دوسری طرف جان لینن (John Lennon) جو بیٹلز پاپ گروپ کا

اہم رُکن تھا کے نام کی دیوار ہے۔ اُس پر مختلف آرٹسٹوں نے تصاویر بنائی ہوئی ہیں اس کے علاوہ یہاں پر مشہور قلعے اور محل Lobkowicz ہے۔ اس کے ساتھ ہی St.George Basilica ایک انتہائی اہمیت کی مذہبی اور عالی شان عمارت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر یہودیوں کا ایک مشہور قبرستان بھی ہے۔ایک بجے ہم 6 سو سال پرانے گھڑیال کے پاس سے گزرے۔ دنیا کے مختلف ممالک سے آئے بے شمار لوگ وہاں موجود تھے۔ اس کے بعد ہم نے یہودیوں کے ریسٹورنٹ میں مچھلی کھائی اور واپس آ گئے۔

آج پراگ کی ایک خوبصورت صبح ہے۔ موسم خاصا معتدل ہے اور بہترین دھوپ نکلی ہوئی ہے۔جس سے شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا ہے۔ ہم 10 بجے فلیٹ خالی کر کے باہر آ کر چرچ کے قریب کھڑے اُوبر ٹیکسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ بہت سے ٹورسٹ اپنے سامان کے ساتھ فٹ پاتھ پر جا رہے ہیں یقیناً یہ لوگ بھی ویک اینڈ گزار کر اب اپنے گھروں کی طرف رواں دواں ہیں۔ٹیکسی سے اُتر کر ہم پراگ کے مین ریلوے سٹیشن میں داخل ہوئے ہیں؛ ایک کیفے کا رُخ کیا ہے اور چائے اور کافی کا آرڈر دیا ہے۔ ہم بروقت اپنی ٹرین میں بیٹھ گئے ہیں اور اب ہمارا سفر پولینڈ کی طرف شروع ہو چکا ہے۔ٹرین آرام دہ ہے اور بہت اچھے انداز سے چل رہی ہے۔ ہم پراگ کو چھوڑ چکے ہیں۔دریائے ولٹاوا (Vltava) جو پراگ میں سے گزرتا ہے اور چیکوسلواکیہ کا سب سے بڑا دریا ہے۔اس دریا پر پل چارلس ہے جہاں کیتھولک سینٹ کے بے شمار مجسّمے ہیں۔ یہ دریا بوہمیا جنگل اور پراگ سے گزرتا ہوا آخر میں دریائے ایلبا میں جا گرتا ہے۔ اس مقام کا نام میلنک ہے۔

اب ہم بوہمیا سے گزرتے ہوئے پولینڈ پہنچنے والے ہیں۔اس سفر میں ہمیں یہ شدت سے محسوس ہوا کہ آج سے 5، 6 سو سال پہلے مسلمان ممالک ہر لحاظ سے سپر پاور تھے۔ ریاضی، الجبرا اور سائنس کے تمام علوم میں دنیا میں سب سے آگے تھے۔ لیکن

بیسویں، اکیسویں صدی میں باقی دنیا سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں جس کی بلاشبہ وجہ جنگوں میں ہار بھی ہے۔ لیکن ایک چیز اور محسوس ہو رہی ہے کہ جو یورپی ممالک، مسلم ممالک سے سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس وقت پیچھے تھے مگر اب بہت آگے ہیں۔ اس کی وجہ ان ممالک کے ادارے ہیں جن میں ایک طریقہ کار یا سسٹم رائج ہوا اور وقتاً فوقتاً اس میں بہتری لائی گئی۔ ان اداروں کو مضبوط بنایا گیا اور مسلمان ممالک میں شخصیت پرستی پر توجہ دی گئی۔ ہر دوسرے تیسرے حکمران نے ان اداروں کو صرف اور صرف اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس طرح اکثر ادارے نہ صرف اپنی افادیت کھوتے چلے گئے بلکہ زیادہ تر ادارے ختم ہوتے چلے گئے۔ اُن کی جگہ لینے والوں کا بھی حشر اُن کے پیش رو اداروں جیسا ہی ہوا۔

ہمیں احساس ہوا کہ بعض یورپین ادارے پانچ سو سال سے چل رہے ہیں۔ فعال ہیں اور ملکی اور ملی ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ بعض مسلم ممالک میں آج بھی اُن کا وجود ہی نہیں ہے۔ سارے معاملات عارضی بنیادوں پر چلتے ہیں۔ ہماری ٹرین فراٹے بھرتی جا رہی ہے اور جلد ہی ہم چیکوسلواکیہ چھوڑ کو پولینڈ میں داخل ہو جائیں گے جو ہمارے لیے کام کرنے والے ڈیرک(Derak)، میرک(Merik) اور کرس (Chris) کا ملک ہے۔ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ یہ تینوں آدمی اس ملک کو چھوڑ کر یو۔کے میں کیوں گئے تھے؟ پھر بھی یہ گتھی سلجھانے کے لیے تھوڑی ریسرچ کریں گے۔

ہم وارسا کے ریلوے سٹیشن پر آدھ گھنٹہ کی تاخیر سے پہنچے۔ اب تقریباً آدھی رات ہوگئی ہے جلدی سے ٹیکسی لے کر اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ٹیکسی نے ہمیں تھوڑا دور اُتار دیا یہ کہہ کر کہ وہ آگے نہیں جا سکتا۔ بہرحال 4، 5 سو گز کے فاصلے پر ہمیں اپنا فلیٹ مل گیا مگر یہ چوتھی منزل پر تھا اور لفٹ بھی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے ہم سامان سمیت فلیٹ میں پہنچے اور سیدھے بستر پر لیٹ کر سو گئے۔

آج کی صبح ہم وارسا کی دل کش دھوپ اور صاف موسم کی وجہ سے بہت خوش ہوئے۔ یورپ میں دسمبر کے وسط میں سردی کا ہونا تو لازم ہے مگر اس کے باوجود یہاں موسم معتدل ہی ہے۔ ناشتے کے لیے ایک کیفے میں گئے اور سارے ٹور کا سب سے خراب ناشتہ ملا اور اس کے بعد ہم سیر کو نکل پڑے۔ دریائے وسلا کے کنارے تھوڑی دیر جانے کے بعد ایک خوبصورت پارک میں گئے جو ملٹی میڈیا پارک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں پر بہت ہی خوبصورت فوارے ہیں جو کافی اُونچا پانی بھی پھینکتے ہیں۔ ہم وارسا قلعہ، اولڈ وارسا ٹاؤن، پیلس آف کلچر اینڈ سائنس اور Castle Square گئے۔ ان سب کے علاوہ پریذیڈنٹ پیلس اور مین سٹریٹ جس میں بڑے بڑے برانڈ مثلاً رولیکس، گوچی وغیرہ کے سٹور ہیں۔ امریکن کیفے میں کافی پی کر اپنے فلیٹ آگئے۔ وارسا میں سوائے Amber کے مختلف قسموں کے زیورات کے علاوہ کوئی خاص تاریخی جگہ یا دلچسپی کا سامان نظر نہیں۔

فلیٹ میں ریسرچ کر کے ٹیکسی منگوائی اور حلال ریسٹورنٹ میں گئے۔ جب وہاں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں پتہ نہیں کھانا حلال ہے یا نہیں۔ ہم وہاں سے نکل کر تھوڑی دور پیدل چلتے ہوئے ایک اور کباب ہاؤس میں گئے۔ سلام کر کے پوچھا کیا کھانا حلال ہے، تو نوجوان نے توقف کے بعد معذرت کرتے ہوئے کہا نہیں۔ یہ نوجوان مسلمان تھا کیونکہ اس نے السّلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السّلام کہا ہم اُس کے شکر گزار ہیں کہ اُس نے ہمیں سچ بتایا۔ آخر فرنچ فرائز کھا کر واپس کرسمس کی خوبصورت روشنیاں دیکھتے ہوئے فلیٹ میں آگئے ہیں۔ کل سویرے ریلوے سٹیشن پہنچ کر برلن جرمنی کی ٹرین میں سوار ہونا ہے۔ اب حقیقت میں سیر کا خاص مزا نہیں آرہا ہے۔ شدت سے انتظار ہے کہ ہم جلد از جلد برسلز پہنچیں۔ مصباح، رئیسہ، حمد، معین الدین، رُقیہ اور محمد طٰہٰ کو ملیں۔ حقیقتاً اب صرف اُن سے ملنے کی تاہنگ زیادہ ہے اور دنیا کے شہروں اور تاریخی مقامات، ریلوں، ہوائی جہازوں وغیرہ سب سے جی اُکتا رہا ہے۔

صرف اور صرف ان سب کو ملنے اور ان کے ساتھ چار دن بلجیم اور فرانس میں گزارنے کا انتظار ہے۔ اس کے بعد باقی فیملی کے افراد سے ملنے اور اپنے گھر جانے کا سوچا جائے گا۔

آج رات تقریباً 12 بجے کے بعد سے فلیٹوں سے نہایت اُونچی آواز میں شور کی وجہ سے آنکھ کُھل گئی اور تقریباً 5 بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ آج ہم نے صبح سویرے برلن جانے کی تیاری کرنی ہے اس لیے اب نیند نہیں آ رہی جس کی پہلی وجہ شور ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تھما ہے۔ دوسری وجہ میرے برلن کے متعلق ملے جلے جذبات ہیں۔اس شہر میں کروڑوں کا نقصان اُٹھانے کے بعد میرا ابھی ادھر رُخ کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ کیوں کہ جرمنی اور خاص کر برلن میں کاروباری مسائل کا سامنا رہا اور ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ہمیں جرمن ہائی کورٹ میں جا کر ایک پراپرٹی واپس کر کے اپنی رقم واپس ملی تھی۔ عدالت جانے میں لاکھوں یورو کا خرچہ برداشت کرنا پڑا وہ تو معمولی تھا۔ کروڑوں کا نقصان دینے والے شہر میں خوشی سے واپس آنا مشکل کام تھا۔ اس کے علاوہ جرمن ٹیکس اتھارٹیز کے ساتھ تقریباً 5 سال بُھگتنا بھی عذاب جان تھا۔ہمیں شروع میں جو منافع ہوا اُس پر وہ ٹیکس لینے پر بضد تھے مگر ہمارا نقصان بہت زیادہ تھا وہ ہمیں Write off کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کی منطق تھی کہ شروع میں جو منافع کمایا ہے اُس پر پہلے ٹیکس دیں، پھر کاروبار کر کے جب مزید منافع کمائیں گے تو اس میں سے نقصان کو آپ Write off کر سکتے ہیں۔ اتنے نقصان اور دھوکے کے بعد ہمارا جرمنی میں کاروبار کا کوئی ارادہ نہ تھا اور نہ ہی مالی سکت تھی۔

جرمن ٹیکس اتھارٹی سے یہ بات منوانے میں عمرِ عزیز کے 5 سال ضائع ہوئے۔ مختصراً جرمنی کی بنی ہوئی اشیاء دنیا میں کوالٹی کے اعتبار سے اوّل درجے کی ہیں اور مہنگی بھی ہیں۔ ہمارے استعمال میں ساری کاریں ساختہ جرمنی ہیں۔ ہمارے گھر میں سامان کچن اور دیگر ضروریات زندگی بھی ساختہ جرمنی ہیں مگر مجھے جرمنی اور اہلِ جرمنی

سے اس نا خوش گوار واقعہ کے بعد کوئی زیادہ اُلفت نہیں رہی۔ نفیسہ بیٹی کو برلن کی مشہور جگہوں کی سیر کرانے کے بعد آج رات کو ہم بلجیم فلائی کر جائیں گے۔ ایئرپورٹ ہوٹل میں رات گزاریں گے اور کل ایئرپورٹ سے ہی بچوں کو ساتھ لے کر برسلز کے Red Raddison ہوٹل میں چار رات بچوں کے ساتھ چھٹیاں گزاریں گے۔ اِن شا اللہ!

ہماری فلائٹ برلن کے ایئرپورٹ سے بروقت اُڑی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ وہی ایئرپورٹ اور وہی ایئرلائن ہے جس سے درجنوں بار میں نے سفر کیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا ہزار شکر ادا کیا کہ آج سے تقریباً گیارہ، بارہ سال پہلے ہم نے جو نقصان اُٹھایا تو اس کے باوجود بھی ہمارے معیار زندگی میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ شاید تھوڑی بہتری ہی آئی ہے۔ دولت آنی جانی چیز ہے اور کاروبار سے نفع نقصان دونوں کا سامان بھی کرنا پڑتا ہے۔ ضروری امر یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کی حق تلفی نہ کرے اور بالخصوص جب حالات اچھے ہوں تو غرور و تکبّر سے پرہیز کرے اور جب برا وقت آئے تو اپنی عزتِ نفس کو برقرار رکھے۔

نفیسہ کو میں نے Brandenburg گیٹ اور Bundstag جرمنی کے پارلیمنٹ بلڈنگ ہے کی سیر کرائی۔ برلن دیوار تو ختم ہو چکی ہے۔ چیک پوائنٹ چارلی دیکھنے میں نفیسہ کو دل چسپی نہ تھی۔ اس کے بعد ہم برلن کے مرکزی ریلوے سٹیشن پر واپس آ گئے۔ وہاں پر ایک حلال ترکش ریسٹورنٹ پر کھانا آرڈر کیا جو بہت اچھا اور مزے دار تھا۔ اسی دوران تھوڑی سی پریشانی ہو رہی تھی کہ ایک بچے محمد طٰہٰ کا نیا پاسپورٹ بے شک آج ہمارے گھر پہنچ جانا تھا ابھی نہیں آیا تھا کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ آ گیا ہے۔ جہاز نے دورانِ پرواز خاصے ہچکولے کھائے اور کئی بار اُس کا توازن بگڑا۔ ہماری فلائٹ وقت سے چند منٹ پہلے پہنچ گئی۔ ہماری امیگریشن تھی اور نہ کسٹم؛ اس لیے ہم جلد ہی اپنا سامان اُٹھا کر ایئرپورٹ سے باہر آ گئے۔

اپنے محسن کی تلاش میں

رات کو ہم بذریعہ شٹل بس اپنے ہوٹل پہنچے۔ ہوٹل کا کمرہ چھوٹا تھا اور معیار اتنا اچھا نہ تھا۔ ہم نے ناشتہ ایئرپورٹ پر کرنے کا پروگرام بنایا اور بچوں کی فلائٹ لینڈ کرنے سے دو گھنٹے پہلے پہنچ گئے۔ میں رات کو سوچ رہا تھا کہ تقریباً 55 سال قبل میں نے جرمنی سے بلجیم کا سفر بذریعہ ٹرین کیا تھا۔ میری عمر سترہ سال تھی اور منزل بلجیم کا شہر Ostend تھا۔ جہاں پر میرے ساتھی مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ جیب میں بھائی میاں افتخار صاحب کے بھیجے ہوئے تقریباً پانچ پاؤنڈ تھے۔ آج اللہ کا شکر ہے میں بذریعہ ہوائی جہاز سفر کر رہا ہوں۔ آج کل بینک کارڈ کی موجودگی میں جیب میں کیش کی ضرورت ہی نہیں۔ اب فوراً دو بیٹیوں، تین نواسوں اور ایک پیاری نواسی کو ملنے کی طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اُس وقت کے سترہ سالہ ذوالفقار اور آج کے ستر سالہ ذوالفقار پر اُس کی ذات کا کتنا کرم ہے۔ میں ایک ناشکرا انسان اُس باری تعالیٰ کی ذات پاک کا شکر بجا لانے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتا۔ 1:30 بلجیم ایئرپورٹ پر رئیسہ، مصباح اور بچے Arrival سے نکلے تو سب سے محمد طٰہٰ نے آ کر گلے لگایا۔ معین الدین، حمد، رُقیہ، رئیسہ اور مصباح سے ملا تو دل کو سکون پہنچا:

؎ جب گلے اپنا خون ملتا ہے
پوچھ مت کیا سکون ملتا ہے

ہوٹل سے بذریعہ وین ہم اپنے برسلز کے شہر کے اندر Red Radisson ہوٹل پہنچے اور دو فیملی سویٹ میں سامان رکھ کر کچھ دیر آرام کیا۔ برسلز کی پیدل سیر کرتے ہوئے ایک ترکش حلال ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا ہے۔اب آدھے بذریعہ ٹیکسی اور آدھے اپنی خوشی سے پیدل واپس ہوٹل پہنچے ہیں۔

آج صبح حمد، معین الدین اور محمد طہٰ کے ساتھ ناشتہ کیا۔ بڑے بچوں نے ہوٹل لابی میں سنوکر ٹیبل پر گیم کھیلنا شروع کر دی۔ میں نے اور محمد طہٰ نے ٹیبل فٹ بال کھیلا۔ اُس کے بعد سب لڑکیوں نے ناشتہ کیا۔ ہم برسلز کے میوزیم کی طرف چلے جو ہمارے ہوٹل کے پاس ہی تھا۔ بچوں نے میوزیم خاص طور پر ڈائنو سار کو خوب انجوائے کیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد ہم میوزیم سے واپس آئے بچوں نے لنچ کیا کچھ دیر آرام کیا اور اس کے بعد ٹیکسیاں منگوا کر Atomium اور منی یورپ کی طرف گئے۔ منی یورپ میں یورپ کے مشہور جگہوں کے ماڈل بنائے گئے ہیں۔Atomium میں ایٹم کی طرح بال بنائے گئے ہیں۔ ہر ایک نمائش کے لیے کمرے بنائے گئے ہیں۔ یہاں سے فارغ ہوتے ہوئے اندھیرا ہو گیا اور ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ ذرا فاصلے پر واقع حلال پاکستانی ریسٹورنٹ میں گئے کڑاہی گوشت، بریانی، پکوڑے، کباب اور تندوری چکن وغیرہ سے پیٹ بھرا۔

دو ٹیکسیوں میں بیٹھ کر ہم برسلز کے (مِڈی) Midi یعنی سنٹرل سٹیشن پہنچے۔ اس کے بعد Brugge کی ٹرین میں سوار ہو کر وہاں گئے۔ میں اور سب بچے نفیسہ اور مصباح کے ساتھ حسبِ پروگرام Brugge ہی رہے۔ شہر کی خوب سیر کی یہ شہر چھوٹا وینس (Mini Venice) بھی کہلاتا ہے کیونکہ یہاں پر بھی خاصی نہریں ہیں جن میں کشتیوں پر شہر کی سیر بھی کی جاتی ہے۔ رئیسہ اور میں دوسری ٹرین پکڑ کر Ostend روانہ ہوئے۔ مجھے ماضی بالکل کل کی بات محسوس ہو رہا تھا جب میں اکیلا سترہ سالہ لڑکا اِسی رستے ٹرین پر ہی برسلز سے Ostend جا رہا تھا۔ میرے باقی ساتھی اس شہر میں

پہنچ چکے تھے۔ مگر مجھے اُن کا ایڈریس معلوم نہیں تھا صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ یہاں پر میر پور کے دو پاکستانی 44 لانگ سٹراس پر قانونی طور پر مقیم ہیں اور کوئلے کی کان میں کام کرتے ہیں۔ میں نے سٹیشن سے نکل کر سامنے ایک ہوٹل کا رُخ کیا اور ایک کمرہ مانگا۔ پاسپورٹ دکھانے کے بعد ہوٹل والوں نے کرایہ مانگا تو پتہ چلا کہ میرے پاس جو پانچ سو بلجیم کی کرنسی تھی وہ ناکافی تھی۔ پھر میں نے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اُٹھایا اور 44 لانگ سٹراس پہنچ کر جھجکتے ہوئے دستک دی۔

ایک پاکستانی مرد نے جو تقریباً 30، 35 کی عمر کا ہوگا نے خوش اخلاقی سے سلام کیا۔ نہایت اپنائیت سے بلایا اور مجھے ذرا بھر اجنبیت محسوس نہ ہونے دی۔ باتوں سے پتہ چلا کہ وہ میرے دوستوں سے مل چکے تھے اور میرے بارے میں اُنھیں معلوم تھا کہ میرے دوستوں کو میرا انتظار ہے۔ سب لوگ میرے اکیلے ہونے کے علاوہ کم سن ہونے کی وجہ سے بھی فکر مند تھے۔ بہرحال اُنھوں نے سب سے پہلے روٹیاں پکائیں اور آلو انڈے نمک مرچ کے ساتھ فرائی پین میں بنائے۔ہم نے لنچ کیا۔ مجھے نہ صرف Frankfurt سے چلتے ہوئے خاصی بھوک بھی تھی بلکہ پاکستان سے نکلنے کے بعد پہلا نمک مرچ والا کھانا دو اڑھائی ماہ کے بعد ملا تھا جسے بہت مزے سے کھایا۔ اُس انسان کی یہ مہمان نوازی آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی میری زندگی کی ایک خوبصورت یاد ہے۔ کسی کی مدد یا نیکی کو بھلانا نہیں چاہیے۔ آج میں اُس شخص کا شکریہ ادا کروں گا اور اگر وہ دنیا میں نہیں تو اُس کی آل اولاد سے مل کر شکریہ ادا کروں گا۔

اُنھیں یادوں کے ساتھ ہم Ostend سٹیشن پر پہنچے؛ گاڑی رُکی اور ہم اُترے۔ رئیسہ کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ مجھے سٹیشن تھوڑا مختلف یاد ہے جہاں پر ہم اُترے وہ حصّہ مجھے یاد نہیں۔ بہرحال تھوڑی دیر میں سٹیشن کی پرانی عمارت بھی نظر آ گئی۔ اب آدھی صدی گزرنے کے ساتھ کچھ تو شہر میں خاصا ردو بدل ہو چکا تھا اور

کچھ یادیں بھی دھندلا چکی تھیں۔ میں نے کہا کہ ہم Beach کی طرف سے چلتے ہیں۔ اس طرح سٹیشن سے نکل کر ہم سمندر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ آخر ایک گلی جو مجھے یاد پڑتی تھی کہ وہاں ہمارا کمرہ تھا جہاں تقریباً دو اڑھائی ماہ رہے۔ تقریباً تمام مکانات اَپ ڈیٹ ہو چکے تھے اُن میں سے ایک مکان کا مجھے شک ہوا۔اُس کا مرکزی دروازہ کھولا اور اندر سے ویسا ہی لگا جیسا مجھے یاد تھا۔ فرق یہ تھا کہ سیڑھیوں کی ریل اور کارپٹ وغیرہ نیا تھا۔ ہال میں چھوٹے چھوٹے چار پانچ پوسٹ باکس بھی موجود نہیں تھے۔ غالباً یہ وہی مکان تھا جہاں ہم رہے تھے۔ رئیسہ نے اُس کے سامنے میری تصویر کھینچی۔ اب ہمارا اصل مقصد 44 لانگ سٹراس کی تلاش تھا۔ میں گوگل میپ کی مدد سے ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس لیے سوچا کہ کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتے ہیں؛ ٹیکسی والے کو تو معلوم ہو گا۔ اس طرح ہم ٹیکسی کو ڈھونڈتے چل رہے تھے کہ ایک آدمی سے میں نے انگریزی میں پوچھا کہ لانگ سٹراس کا راستہ کدھر ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ تو بزنس ایریا میں ہے۔ رئیسہ نے اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ پاکستانی ہے۔ اب میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو اُس نے بتایا کہ وہ تو اس شہر میں پچھلے دو سال سے رہ رہا ہے۔ البتہ وہ یہاں پرانے رہنے والے پاکستانیوں سے پتہ کرا کر ہماری مدد کرے گا۔

وہ ہمیں اپنی دکان پر لے گیا۔ اصرار کرنے لگا کہ چائے کافی پی لیں اور ریسرچ کرتے ہیں۔ ہم نے اُس کی بیوی اور بچی سے ملاقات کی۔ اُن لوگوں کی دکان میں اُن کی مہمان نوازی سے متاثر ہوئے۔ میاں صاحب نے دو چار لوگوں کو فون کیے تو سب کے سب تقریباً بیس سے تیس سال کے رہنے والے نکلے۔ بہر حال ہم نے شکریہ ادا کیا اور وہ صاحب ہمیں اپنی کار پر ریلوے سٹیشن اُتار گئے۔ ایک امام مسجد کے گھر گئے (جو یہاں پرانے رہنے والے تھے۔) مگر وہ گھر پر نہیں تھے۔

ہماری ٹرین چلنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا؛ ٹرین آئی اور ہم بیٹھ گئے۔

ٹرین کی روانگی میں آخری منٹ تھا کہ میاں صاحب نے فون کیا کہ اُن سے غلطی ہو گئی ہے۔ ابھی اُن کی بات امام صاحب سے ہوئی ہے جنھوں نے بتایا ہے کہ ایک دکان والا دیوان صاحب کی اولاد سے ہے۔ دیوان صاحب 1960ء کے عرصہ میں یہاں مقیم تھے۔ غالباً کوئلے کی کان میں بھی کام کرتے رہے ہوں گے۔ ہم ریل گاڑی سے اُترے اور واپس اُن صاحب کی دکان پر پہنچے۔ اُنھوں نے دکان بند کی اور ہمیں ساتھ لیے تھوڑی دیر بعد گروسری کی دکان پر پہنچے۔ ایک درمیانی عمر کی عورت ٹِل پر کام کر رہی تھی۔ اُن صاحب نے ہمارا تعارف کرایا اور مقصد بتایا۔ پتہ چلا کہ یہ لیڈی حقیقتاً دیوان صاحب کی بہو ہے جو انگلینڈ کے شہر بیڈفورڈ سے آئی ہے۔ بہو نے بتایا کہ اُس کے سسر دیوان صاحب کو فوت ہوئے دس بارہ برس گزر گئے ہیں۔ وہ 1960ء میں بلجیم کے شہر Ostend میں تھے۔ زیادہ معلومات اُن کے تیسرے بیٹے کو ہو گی جو تقریباً اب 60 سال کا ہے مگر اس شہر میں نہیں ہے۔ اس لیے ملاقات ممکن نہیں۔ میری بدقسمتی تھی کہ میں اپنے محسن سے ملاقات نہیں کر پایا۔ اس بات کا مجھے ہمیشہ قلق رہے گا۔ میں بوجھل دل سے آہ بھرتے ہوئے لوٹ آیا۔

ے تھی وہ اِک شخص کے تصوّر سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں

ہم میاں صاحب کا شکریہ ادا کر کے واپس ریلوے سٹیشن پہنچے جہاں سے Brugge واپس آ گئے۔ جہاں باقی بچوں کے ساتھ ملے اور یہاں کی مشہور بلجیم چاکلیٹ کی خریداری کی۔ اُسی وقت ایک کرسمس کا جلوس جا رہا تھا۔ کچھ وقت Brugge کی سیر کرنے کے بعد ہم بذریعہ ٹرین برسلز واپس آ گئے۔ میں نے رئیسہ اور مصباح کو بتایا کہ بیٹا! جس وقت میں بطور سترہ سالہ نوجوان ادھر پہلی بار آیا تھا تو میرے خوابوں اور خیالوں میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ باری تعالیٰ کی ذات مجھ پر اتنا کرم کرے گی کہ ایک دن میں اپنی تین بیٹیوں، تین نواسوں اور ایک نواسی کے ساتھ

دوبارہ اس شہر میں آؤں گا اور آدھی دنیا کی سیر کا اختتام کروں گا۔ بقول نفیسہ ذوالفقار:

''زندگی کے ایک نہایت اہم، طویل، کٹھن، تاریخی اور یادگار سفر پر مختصر تبصرہ ممکن نہیں۔ حیران کُن بات یہ ہے کہ ہمارا سفر 17 ملکوں، 15 فلائٹوں، 12 ریلوں، 4 سلیپروں، اَن گنت ٹیکسیوں، بسوں، کوچوں حتیٰ کہ گھوڑوں کی سواری پر مشتمل تھا۔ یورپ بہت ہی عمدہ اور آرام دہ تھا۔ سب کچھ پُرتعیّش تھا۔ کھانا صاف ستھرا اور معیاری تھا۔ مگر یورپ میں وہ دل نہیں تھا؛ وہ روح نہ تھی جو اُن ملکوں میں تھا جہاں سہولیات کا فقدان تھا جہاں سے سفر کر کے آئے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہم یورپ میں رہتے ہیں اور یہاں کے طور طریقے، معیارِ زندگی اور سہولیات کے عادی ہیں۔ اس لیے واپس یورپ میں آنے پر ایک جسمانی راحت ضرور ملی۔ چوں کہ ہمارا خون مشرقی ہے اس لیے سکون صرف مشرق میں ہی ملا۔ ایک حقیقت آج مجھ پر آشکار ہوئی ہے کہ میرے لوگ، میرا قبیلہ اور سب سے ضروری میرے دل کی وابستگی ہمیشہ مشرق میں ہی رہے گی۔''

ے تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائے دار ہو گا

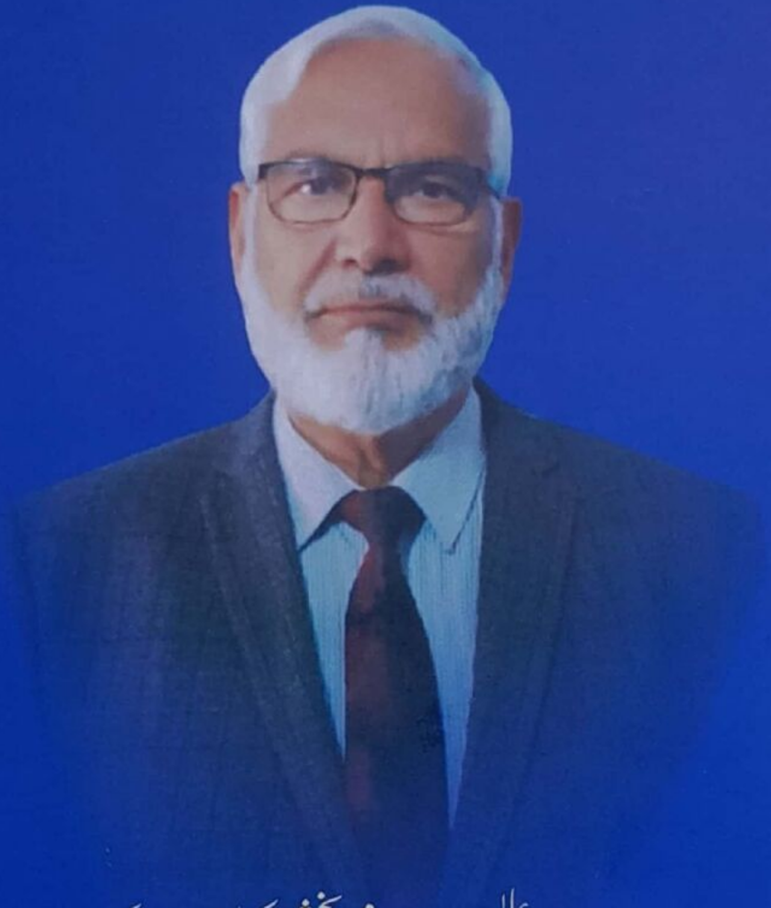

سرپرستِ اعلیٰ : میاں محمد بخش اکیڈمی، یوکے

کوچیئرمین : اُمہ کیئر فاؤنڈیشن، یوکے

سابق ڈائریکٹر : احمد فلپ مورگن سٹیٹ ایجنٹ، یوکے

سابق ڈائریکٹر : مورگن فنانشل سروسز، یوکے

سابق ڈائریکٹر : اورکس کیپٹل لمیٹڈ، یوکے

Misaal PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com

9 789695 816172 >